مغربی بنگال کے گورنر ایس. ایس دھاون اور کلکتہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس پی. بی. مکرجی نے اس میں خاص طور پر شرکت کی، انکی تقریریں بھی ہیں، جن سے ایران سوسائٹی کی اہمیت کا اندازہ ہوگا، اسکے سرگرم سکریٹری ایم. اے مجید کی رپورٹ سے اسکے مختلف کارناموں پر روشنی پڑتی ہے، اس جشن میں فارسی اور اردو میں جو نظمیں پڑھی گئیں وہ بھی اس میں ہیں، پھر علمی حیثیت سے وہ مقالات بڑے مفید ہیں جو اس موقع پر پیش کیے گئے، ان میں کچھ یہ ہیں: فارسی حروف تہجی از ڈاکٹر محمد اسحٰق. ہندی الایرانی عہد از پروفیسر فیروز سی داور شوریدہ شیرازی از ایم. اے مجید. ہند و ایران کے تعلقات از ڈاکٹر جی. ادئی دت. سبک ایرانی کے علمبرداروں کو ہندوستانی اہل علم کے تحفے از سید صباح الدین عبدالرحمٰن، اردو کا عظیم شاعر، غالب از پروفیسر مسعود حسن. ڈاکٹر محمد اسحٰق. تاثرات، از خواجہ محمد یوسف. پروفیسر سید حسن، ڈاکٹر حیدر نیر. پہلوی خاندان کے زمانہ میں تعلیم از مہدی شیخانی. کرشن چندر سین. بنگال میں فارسی اور عربی کا ایک فاضل از ڈاکٹر عطا کریم. زبان فارسی در ایالت تامل نادو از حیدر علی خاں جنگجو. رابطہ ہند و ایران در عصر حاضر، از ڈاکٹر حکیم الدین قریشی. مرزا غالب دہلوی از ڈاکٹر مصطفیٰ عباسی. مجموعی حیثیت سے یہ نمبر بڑے سلیقہ اور معیار کے ساتھ نکالا گیا ہے، اسکے مدیر انتظامی خواجہ محمد یوسف خاص طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

"ص"

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	عطاء اللہ
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	"
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین
اڈیٹر	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	"

میں عطاء اللہ تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ عطاء اللہ

جلد ۱۰۷ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۱ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۱ء عدد ۴

مضامین

مقالات

تلخیص و تبصرہ

شذرات

مشرقی پاکستان کے خونیں واقعات سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہر انسانیت دوست کا دل بیقرار ہے، خود مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی خونریزی اور پاکستان جو کتنی قربانیوں اور کیسی کیسی امیدوں سے قائم ہوا تھا، اس کا یہ حسرتناک انجام کس قدر عبرت انگیز ہے، تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں کو غیر مسلموں سے زیادہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں نقصان پہنچا ہے، آج پاکستان میں یہی تاریخ دہرائی جا رہی ہے

ہر کس از دست غیر نالہ کند سعدی از دست خویشتن فریاد

اس وقت اس کے اسباب اور تفصیلات پر بحث کرنا معاملہ کو بڑھانا ہے، ضرورت اسکی ہے کہ اس خانہ جنگی کو ہر قیمت پر جلد سے جلد ختم کرنے کی کوشش کیجائے اور اس کی ذمہ داری فریقین پر عائد ہوتی ہے، اختلافی مسائل اپنی بات پر اڑے رہنے سے نہیں بلکہ مفاہمت سے سلجھتے ہیں۔

مغربی پاکستان والے اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ کسی تحریک کو تشدد کے ذریعہ ہمیشہ کے لیے نہیں دبایا جا سکتا، اس سے اور شدت پیدا ہوگی، جس سے دونوں کو نقصان پہنچے گا، اگر پاکستان کو بچانا ہے تو ملک کی سالمیت کو برقرار رکھکر سارے اختیارات مشرقی پاکستان کے حوالے کر دیے جائیں ورنہ کوئی قوت اسکو علحدگی سے نہیں روک سکتی، مشرقی پاکستان والوں کو بھی محض جذبات کی رو میں نہ بہنا چاہیے بلکہ حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے، ان میں ابھی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی طاقت نہیں ہے، اور مغربی پاکستان سے علحدگی کے بعد ان کی قوت اور گھٹ جائیگی اور وہ دوسری قوتوں کا سہارا لینے پر مجبور ہونگے، جس کی اتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑے گی کہ اس کا اندازہ تجربہ کے بعد ہی ہوگا۔

مشرقی پاکستان والوں کی اکثریت ان کے مطالبات پورے ہونے کی سب سے بڑی ضمانت ہے، وہ جیسا دستور چاہیں گے بنا سکیں گے، مرکزی حکومت ان کے ہاتھ میں ہوگی، اسکو جس طرح چاہیں گے چلائیں گے، اکثریت میں ہوتے ہوئے جمہوری حکومت میں مغربی پاکستان کی ماتحتی کا کوئی سوال ہی نہیں بلکہ مغربی پاکستان انکے ماتحت ہوگا، اور اگر جلد بازی سے کام نہ لیا جاتا تو یہ نوبت ہی نہ آتی اور مشرقی پاکستان کے سارے مطالبات پورے ہو جاتے، اس لیے موجودہ حالات کی ذمہ داری سے وہ بھی بری نہیں ہیں اب بھی اگر فریقین سمجھداری سے کام لیں تو پاکستان تباہی سے بچ سکتا ہے۔

مشرقی پاکستان کی خونریزی کی جتنی مذمت کیجائے سب بجا ہے، لیکن بنگالی مسلمانوں نے مہاجرین کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ بھی کم افسوسناک نہیں ہے، انکے ساتھ انکا سلوک ہمیشہ نہایت نازیبا رہا، اور اس ہنگامہ میں انھوں نے جس بے دردی سے مہاجرین کو ہلاک اور ان کو تباہ و برباد کیا ہے اسکی توقع ایک مسلمان سے نہیں ہو سکتی تھی، یہ دھبہ ان کے دامن سے مٹائے نہیں مٹ سکتا، ان واقعات سے ہندوستان کے وہ تمام مسلمان واقف ہیں جن کے اعزہ مشرقی پاکستان میں ہیں، یحییٰ خاں کے بیانات بھی اس پر شاہد ہیں، اور خود شیخ مجیب الرحمٰن کی تقریروں میں اسکی طرف اشارہ ہے۔

حق جوار اور انسان دوستی دونوں حیثیتوں سے مشرقی پاکستان کے ساتھ ہندوستان کی اخلاقی ہمدردی انسانی فریضہ ہے، لیکن اس کی حمایت میں حد سے زیادہ جوش و خروش سے اسکا رخ بدل جانے اور مشرقی و مغربی پاکستان کے بجائے ہندوستان اور پاکستان کا مسئلہ بنجانے کا اندیشہ ہے، جس سے ہندوستان کی ہمدردی کا وزن بہت گھٹ جائیگا، اس وقت حالات ایسے نازک ہیں کہ ادنی بے احتیاطی سے مشرقی پاکستان کا مسئلہ بین الاقوامی سیاست کا اکھاڑا بن سکتا ہے جو خود ہندوستان کے لیے مضر ہے، اسلیے ان دونوں پہلوؤں پر نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے، اور ہم کو خوشی ہے کہ ان نزاکتوں پر عاقبت اندیش سیاسی مبصرین اور خود مسز اندرا گاندھی کی نظر ہے اور

ان کا رویہ اس معاملہ میں بہت محتاط اور دانشمندانہ ہے۔

گذشتہ الیکشن میں حکمراں کانگریس کو جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے، الیکشن سے پہلے خود
اس کو اس کا گمان نہ تھا، یہ ہندوستانیوں کے سیاسی شعور کا ثبوت ہے کہ انھوں نے متحدہ محاذ کے
ہرطرح کے پروپیگنڈے اور ترغیب و ترہیب کے باوجود صحیح فیصلہ کیا، اس کامیابی میں مسلمانوں کا بڑا ہاتھ ہے،
اس مرتبہ انھوں نے من حیث القوم متحدہ قوت سے اندرا کانگریس کا ساتھ دیا، اس لیے اب خود
اس کے امتحان کا وقت آگیا ہے کہ وہ کہاں تک مسلمانوں کی شکایتوں کا ازالہ اور ان کے مطالبات
پورے کرتی ہے، اس طرف کانگریس کمیٹی میں جو بحثیں ہوئیں اور کانگریسی لیڈران نے جو بیانات دیے
ہیں ان میں اچھوتوں کو زیادہ سے زیادہ حقوق دینے کا عزم ظاہر کیا گیا ہے، لیکن مسلمانوں کا کوئی تذکرہ
نہیں ہے، لیکن ہم کو اندرا گاندھی سے توقع ہے کہ انھوں نے اپنے مینی فسٹو میں مسلمانوں سے جو
وعدے کیے ہیں ان کو پورا کریں گی۔

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم صدر شعبۂ اردو کشمیر
یونیورسٹی نے دفعۃً انتقال کیا، اس سے پہلے وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں تھے، ان کا وطن بھی حیدرآباد
تھا، پروفیسر زور مرحوم کے انتقال کے بعد ان کی جگہ کشمیر یونیورسٹی میں آگئے تھے، مرحوم اردو
زبان کے بڑے مخلص خدمت گذار تھے، اگرچہ وہ شعبۂ اردو کے صدر اور متعدد کتابوں کے
مصنف تھے، لیکن ان میں طالب علمانہ شوق اور طلب تھی، انجمن ترقی اردو کے جلسوں میں
بارہا ان سے ملاقات ہوئی، بڑے متواضع اور خاکسار تھے، اللہ تعالیٰ ان کی
مغفرت فرمائے۔

مقالات

ملک العلماء، قاضی شہاب الدین دولت آبادیؒ

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی

اسلامی تاریخ میں بہت سے علماء اپنے علم و فضل اور شاندار علمی کارناموں کی وجہ سے
بڑے بڑے القاب و خطابات سے یاد کیے گئے ہیں، مگر ان میں سے تین اقلیم علم و دانش کے
بادشاہ قرار دیے گئے ہیں، ایک مشہور حنفی امام و فقیہ شیخ علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاشانی متوفی
۵۸۷ھ صاحب البدائع والصنائع ان کا لقب ملک العلماء تھا، دوسرے امام ابو محمد
عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسلام سلمی شافعی متوفی ۶۶۰ھ، ان کو ان کے مجددانہ کارناموں
کی وجہ سے سلطان العلماء کا لقب دیا گیا، تیسرے ہندوستان کی مشہور عہد آفریں عہد ساز
شخصیت قاضی شہاب الدین دولت آبادی متوفی ۸۴۹ھ۔ ان کو بھی ملک العلماء
کے لقب سے ملقب کیا گیا،

ملک العلماء، قاضی شہاب الدین دولت آبادی علوم و فنون میں امامت و عبقریت کا مقام
رکھتے تھے، اور شریعت و طریقت کے درمیان واسطۃ العقد تھے، اور اپنے دور میں عالم اسلام
کے مصنفین کبار میں شمار کیے جاتے تھے، ان کے علمی کمالات و خصوصیات کی وجہ سے ملک العلماء
ان کے نام کا جزء بن گیا،

واقعہ یہ ہے کہ ملک العلماء اپنے علمی کارناموں کے تنوع میں عہد آفرین و انجمن ساز تھے، جنھوں نے جونپور کی شرقی سلطنت کے دور میں دیار پورب کے قریہ قریہ میں علم و معرفت کی شمع فروزاں کی جس کی روشنی سے پورا ہندوستان منور ہوا۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

شرقی سلطنت کے حدود یعنی صوبۂ اودھ، صوبۂ الٰہ آباد اور صوبۂ اعظم آباد میں بادشاہت تو سلطان ابراہیم شاہ شرقی کی تھی، مگر حکمرانی ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی تھی، اس دور کے امراء و سلاطین اور علماء و مشائخ سب نے ان کی عبقریت کا اقرار کیا، اہل بصارت کی طرح اہل بصیرت نے ان کے علمی و دینی حسن و جمال کا اعتراف کیا، اور دانشوروں کی طرح دیدہ وروں نے ان کی جناب میں تشکر و امتنان کا ہدیہ اور ادب و احترام کا نذرانہ پیش کیا، ان کی شخصیت ہر طبقہ کے لیے پرکشش تھی، پھر یہ عقیدت ان کے ساتھ ختم نہیں ہوگئی بلکہ بعد کے تذکرہ نگاروں نے بھی ان کے ساتھ بڑی عقیدت و محبت کا مظاہرہ کیا، اسی عقیدت کا مظہر یہ بھی ہے کہ ان کی وفات کے تقریباً ساڑھے پانچ سو سال کے بعد ان ہی کے دیار علم و فضل کا ایک بے بضاعت عقیدت مند اور عجب کیا کہ ان ہی کے سلسلۂ درس و تدریس کا ایک ادنیٰ طالب علم آج ان کی خدمت میں یہ گلہائے عقیدت پیش کر رہا ہے۔

ملک العلماء کے تذکرہ کے ماخذ و مصادر

(۱) ہمارے علم میں ملک العلماء قاضی القضاۃ شہاب الدین دولت آبادیؒ کا سب سے قدیم تذکرہ لطائف اشرفی میں ہے جو حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی متوفی ۸۰۸ھ کے ملفوظات و حالات کا مجموعہ ہے، اور جسے ان کے مرید و خلیفہ شیخ نظام الدین غریب یمنیؒ نے جمع کیا ہے، ملک العلماء سید صاحب کے اجلّ خلفاء میں ہیں اور شیخ نظام الدین ان کے معاصر اور خواجہ تاش ہیں، اس لیے لطائف اشرفی میں ملک العلماء کے

جو علمی و روحانی حالات درج ہیں وہ نہایت مستند و معتبر ہیں، اندرونی قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب ملک العلماء کی زندگی میں لکھی گئی ہے، اس لیے بھی ان کا تذکرہ ہر اعتبار سے نہایت معتمد و موثق ہے۔

(۲) حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ متوفی ۹۴۵ھ نے انوار العیون فی اسرار المکنون میں جو کہ حضرت شیخ احمد عبد الحق ردولویؒ متوفی ۸۳۷ھ کے ملفوظات و احوال میں ہے۔ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے دربار میں ملک العلماء اور شیخ احمد عبد الحق کی ملاقات کے ضمن میں نہایت شاندار الفاظ و القاب میں ملک العلماء کا تذکرہ ہے، ملک العلماء شیخ عبد القدوسؒ کے جد مادری میں ہیں، ان کے دادا شیخ صفی الدین ردولوی ملک العلماء کے نواسے تھے۔

(۳) محمد قاسم نے تاریخ فرشتہ (سنہ تالیف ۹۹۸ھ) میں آپ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں قاضی صاحب سے سلطان ابراہیم شرقی کے عقیدت مندانہ اور جذباتی تعلقات کے ذکر کے ساتھ ان کی تصانیف کا ذکر بھی ہے، اور خاندانی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

(۴) حضرت مولانا شاہ عبد الحق محدث دہلویؒ متوفی ۱۰۵۲ھ کی کتاب اخبار الاخیار (سنہ تالیف ۹۹۹ھ) میں قاضی صاحب کا مستقل تذکرہ ہے، اور ان کے حالات سے زیادہ ان کی تصانیف کا تذکرہ و تعارف ہے، اور دوسرے اصحاب تراجم کے ضمن میں بھی قاضی صاحب کے بارے میں بہت سی مفید باتیں ملتی ہیں، جن سے ان کی زندگی پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے، یہ کتاب ہندوستان کے علماء و مشائخ کے حالات کا مستند ترین ماخذ ہے۔

(۵) اخبار الاصفیاء (قلمی) میں شیخ افضل محمد تمیمی انصاری اکبر آبادیؒ متوفی ۱۰۰۳ھ

کے صاحبزادے شیخ عبدالصمد انصاریؒ نے قاضی صاحب کے ذاتی حالات مختصر لکھے ہیں اور ان کی کتاب بحر مواج اور مناقب السادات کے بارے میں تفصیل سے کام لیا ہے، اور شیخ محمد بن عیسیٰ جونپوری کے تذکرہ میں قاضی صاحب اور مولانا فقیہ حیرتیؒ کے درمیان ایک مباحثہ کا ذکر کیا ہے جو سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے دربار میں ہوا تھا،

(۶) ملا کاتب چلپیؒ متوفی ۱۰۶۷ھ نے کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون میں قاضی صاحب کی متعدد تصانیف اور ان کی شروح وحواشی کا ذکر کیا ہے، جن سے ان کی کتابوں کی شہرت ومقبولیت کا پتہ چلتا ہے،

مذکورۂ بالا چھ کتابیں قاضی صاحب کے حالات کا قدیم اور اصل ماخذ ہیں، بعد کی کتابوں میں ان کے بارہ میں جو کچھ ملتا ہے وہ ان ہی کی کتابوں سے ماخوذ ومنقول ہے، البتہ ان میں سے بعض کتابوں میں دوسرے تراجم کے سلسلہ میں قاضی صاحب اور انکے متعلقین ومتوسلین کے مزید حالات بھی ملتے ہیں، خاص طور سے (۷) تذکرہ علمائے ہند اور (۸) نزہۃ الخواطر میں ان کے تین نواسوں اور شاگردوں کا اچھا خاصہ تذکرہ ہے، (۹) سبحۃ المرجان فی آثار الہندوستان (۱۰) مرآۃ الاسرار (قلمی)، (۱۱) مشکوۃ النبوۃ (قلمی) (۱۲) خزینۃ الاصفیاء (۱۳) تجلی نور اور (۱۴) برکات الاولیاء میں بھی قاضی صاحب کا ذکر ہے، مگر ان میں کوئی نئی بات نہیں ملتی ہے، صرف پرانی باتوں کو دہرایا گیا ہے، اس مضمون کی ترتیب کے سلسلے میں مندرجۂ بالا کتابیں ہمارے سامنے ہیں، اوپر کی چھ کتابیں اصل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں، باقی معاون کی۔

علماء، مشائخ، معاصرین اور مورخین کی نظر میں

اقلیم علم وفن کے جس کج کلاہ کا تذکرہ ہونے والا ہے، اس کی شان وشوکت کا اندازہ ان الفاظ سے کیا جاسکتا ہو جو اس کے

بارے میں معاصرین اور بعد کے سوانح نگاروں کے زبان وقلم سے نکلے ہیں، اس سے قاضی صاحب کے علمی مرتبہ کا پتہ چلتا ہے، جس شاگرد کے بارے میں مولانا عبدالمقتدر دہلوی جیسے فاضل روزگار نے فخریہ انداز میں یہ کہا ہو، وہ آگے چل کر کیا ہوا ہوگا؟

بیش من طالب علمے می آید کہ پوست او علم — میرے سامنے ایک ایسا طالب علم آرہا ہے

ومغز او علم، واستخوان او علم است، واز یں — جس کا گوشت پوست اور مغز واستخوان

طالب علم قاضی شہاب الدین می خواست[1] — علم ہی علم ہے اور اس سے مراد قاضی شہاب الدین ہیں

استادی وشاگردی کی تاریخ میں یہ الفاظ یادگار رہیں اور رہیں گے، جس طالب علم کے ذوقِ طلب کا یہ حال تھا، بعد میں اس کا علمی مقام کیا رہا ہوگا۔

اس طالب علم کے مقامِ علم وفضل کا اعتراف اس کے شیخ ومرشد اور اپنے زمانہ کے مشہور روحانی بزرگ اور عالم ومصنف حضرت سید اشرف سمنانیؒ متوفی ۸۰۸ھ نے ان گرانقدر الفاظ میں کیا ہے:۔

درہندوستان ایں مقدار فضیلت — ہم نے قاضی شہاب الدین جیسی فضیلت وبزرگی

درکسے کم دیدہ ایم[2] — ہندوستان کے اندر کسی دوسرے میں کم دیکھی ہے،

ایک دوسرے موقع پر ان کی جامعیت کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں:۔

برادر اعز وارشد، جامع العلوم قاضی — برادر اعز وارشد جامع قاضی شہاب الدین

شہاب الدین نور اللہ قلبہ بانوار الیقین — کے قلب کو اللہ تعالیٰ ایمان ویقین کے انوار سے منور کرے۔

ایک جگہ ان کی علمی برتری کو اس انداز میں بیان فرمایا ہے

ہرچند جو اور قدوۂ علمائے روزگار وزبدۂ — مسلم ہے کہ میرے بھائی! آپ اس زمانہ کے

[1] اخبار الاخیار ذکر قاضی عبدالمقتدر ص ۱۴۸، مطبع مجتبائی دہلی قدیم [2] لطائف اشرفی ج ۲ ص ۱۰۶ نصرت المطابع دہلی۔

فضلائے ہر دیار است۱؎	علماء کے پیشوا اور ہر مقام کے فضلاء کے خلاصہ ہیں۔

سید اشرف سمنانی کے خلیفہ و خادم اور قاضی صاحب کے برادر روحانی شیخ نظام الدین غریب یمنیؒ نے اپنے اس معاصر عالم کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے جن سے ان کے علمی مقام و مرتبہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے:

امام روزگار، وہمام دیار قاضی شہاب الدین	امام وقت، پیشوائے دیار، علمائے کبار کے
کہ مقتدائے علمائے فحول وپیشوائے	مقتداء اور اصول و فروع کے بلغاء و فصحاء
بلغائے فروع و اصول است۲؎	کے رہبر قاضی شہاب الدین۔

دوسری جگہ اس امام روزگار اور ہمام دیار کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

در میں خلفائے ولایت مآب، و بہترین ندمائے	قاضی صاحب سید اشرف کے اہل خلفاء اور
اصحاب اند، جامع بودہ میانِ علوم ظاہری	افضل اصحاب میں سے ہیں، وہ علوم ظاہری و باطنی
و باطنی، صاحب معاملات یقینی و جامع واردات	کے جامع اور معاملات ایمانی و ایقانی اور
دینی شدہ بود، تشریع بسیار داشت، ریاضات	واردات دینی و اسلامی کے نقطۂ اتصال تھے،
شدیدہ و مشاہدات جدیدہ کشید کہ اشرف	شریعت کے معاملہ میں بہت زیادہ بیدار تھے،
خلافت و اجازت یافتہ۳؎	ریاضات شدیدہ اور مشاہدات جدیدہ میں
	اس قدر جد و جہد کی کہ اشرف ترین خلافت

سید اشرف سمنانی کے ایک دوسرے مرید و خلیفہ اور قاضی صاحب کے معاصر اور برادر روحانی شیخ واحدی نے ان کے اقلیم علم کی وسعت کا ذکر ایک قطعہ میں اس طرح کیا ہے:

لشکرِ علم تو بہ تیغ بیان | از عجم تا عرب گرفتہ دیار

چوں گرفتی عراق و عربیت | فارسی را بواحدی بگذار۴؎

۱؎ اخبار الاخیار ص ۱۶۳ ذکر سید اشرف ۲؎ لطائف اشرفی ج ۱ ص ۱۰۰ ۳؎ ایضاً ج ۲ ص ۱۰۶

اس قطعہ میں شیخ واحدیؒ نے غالباً حافظ شیرازیؒ کے اس شعر کو پیش نظر رکھا ہے:

عراق و پارس گرفتی بشعر خود حافظ | بیا کہ نوبتِ بغداد و وقتِ تبریز است

حضرت شیخ فتح اللہ اودھیؒ متوفی ۱۲۸۲ھ نے قاضی صاحب کے علم و فضل کا یہ اعتراف کیا کہ اپنے مسترشد خاص شیخ محمد بن عیسٰی جونپوری کو ظاہری علوم کی تحصیل و تکمیل کے لیے ان ہی کے پاس بھیجا، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

باشارتِ پیر مدتے پیش ملک العلماء	شیخ محمد بن عیسٰی نے اپنے پیر شیخ فتح اللہ
شہاب الدین تلمذ کرد۱؎	اودھی کے اشارہ پر ایک مدت تک ملک العلماء
	قاضی شہاب الدین کی شاگردی کی۔

سلسلۂ مداریہ کے بانی و پیشوا شاہ بدیع الدین مدار مکنپوری متوفی ۸۳۶ھ نے بعض علمی و دینی مسائل و مباحث میں ان سے خط و کتابت کی، شاہ صاحب لکھتے ہیں:

مکتوبے در مردم است گویند کہ	شاہ مدار کا ایک مکتوب ایک گمنام شخص
شاہ مدار آں را بجانب قاضی	کے بارے میں ہے، کہتے ہیں کہ اسے شاہ مدار نے
شہاب الدین گذشتہ بود۲؎	قاضی شہاب الدین کو لکھا تھا۔

قاضی صاحب کے بارے میں ان کے معاصرین کے یہ خیالات اس کا ثبوت ہیں کہ ان کی نگاہ میں قاضی صاحب کا کیا مقام تھا، بعد کے علماء و فضلاء اور اہل نظر نے بھی قاضی صاحب کی جلالتِ شان اور علمی جامعیت کا اعتراف کیا ہے، حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ متوفی ۹۴۴ھ نے ایک موقع پر ان گرانقدر خطابات و القابات سے یاد کیا ہے،

صدر العلماء، بدر الفضلاء، استاذ الشرق | مخدوم قاضی شہاب الدین نور اللہ مرقدہ

۱؎ اخبار الاخیار ص ۱۷۵ ۲؎ ایضاً ص ۱۶۰ ذکر شاہ مدار

والغرب، عالم ربانی نعمان ثانی، مخدوم قاضی شہاب الدین ثریا نور اللہ مرقدہٗ[1]

صدر العلماء، بدر الفضلاء، استاذ الشرق والمغرب عالم ربانی اور نعمان ثانی تھے۔

شیخ عبد القدوسؒ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؓ کی نسل سے تھے، اور قاضی صاحب شیخ عبد القدوس کے پرنانا ہوتے ہیں۔

شاہ عبد الحق صاحب محدث دہلویؒ متوفی ۱۰۵۲ھ قاضی صاحب کے علم و فضل کے بارہ میں لکھتے ہیں:

شہرت اوصافش مستغنی است از شرح اگرچہ در زمان او دانشمندان بودہ اند کہ استادان و شریکان او بودہ، اما شہرت و قبولے کہ حق تعالیٰ او را عطا کرد ہیچ کس را از اہل زمان او نکرد[2]

ان کے اوصاف و کمالات کی شہرت و ناموری شرح و بیان سے مستغنی ہے، ان کے زمانہ میں ان کے شریک درس اور اساتذہ میں بہت سے علماء موجود تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے جو شہرت و قبولیت قاضی صاحب کو عطا فرمائی تھی ان میں سے کسی کو اس سے نہیں نوازا تھا۔

شیخ عبد الصمد بن شیخ افضل محمد انصاری لکھتے ہیں:

صیت کمالات او و آوازۂ دریافتش بمرتبہ مشہور تر از آن ست کہ نگاشتہ قلم بدائع نگار آید، الحق در ہندوستان چنو کم بظہور آمدہ، دانش رسمی را پیش مولانا خواجگی و قاضی عبد المقتدر تحصیل اندوختہ

ان کے کمالات کا شہرہ اور ان کے علم کا آوازہ اس سے بالاتر ہے کہ قلم کی رنگیں بیانی کی مرہون منت ہو، حق یہ ہے کہ ہندوستان میں قاضی صاحب جیسے کم علماء پیدا ہوئے ہیں، رسمی علوم مولانا خواجگی اور قاضی عبد المقتدر سے حاصل کر کے اپنے علم کا

[1] انوار العیون ص ۳۳، گلزار محمدی لکھنؤ ۱۲۹۵ھ [2] اخبار الاخیار ص ۱۷۵

کاخ سخنوری را اساس بلند نہاد، و گلشن علم را آب یاری فطرت عالی طراوت بخشیدہ بر علماء روزگار چیرہ دست آمدہ[1]

قصر عالی تعمیر کیا، اور گلشن علم کو فطری صلاحیت کی آبیاری سے تر و تازگی بخشی

علامہ غلام علی آزاد بلگرامیؒ متوفی ۱۲۰۰ھ نے اپنے محتاط اور جچے تلے الفاظ میں قاضی صاحب کے بارے میں لکھا ہے:-

ففاق علی اقرانہ وسبق اخوانہ .... فزین مسند الافادۃ، وفاق البرجیس فی افاضۃ السعادۃ[2]

اپنے اقران و معاصرین پر فائق ہو کر اپنے تمام دوستوں سے آگے بڑھ گئے اور درس و افادہ کی مسند کو زینت بخشی اور سعادت فیض پہنچانے میں برجیس پر بھی سبقت لے گئے

خزینۃ الاصفیاء میں ہے:-

در علوم ظاہری طاق، و در علوم باطنی شہرۂ آفاق بود، قلم و زبان را طاقت آن نیست کہ تحریر و تقریر اوصافش پردازد، در عہد خود قبولے عظیم یافت[3]

آپ علوم ظاہری میں فرد زمانہ اور علوم باطنی میں شہرۂ آفاق تھے، زبان و قلم میں آپ کے اوصاف و کمالات کے لکھنے اور بیان کرنے کی طاقت نہیں ہے، اپنے زمانہ میں عظیم مقبولیت

صاحب مشکوٰۃ النبوت نے قاضی صاحب کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں:-

آن مرد آزادے، آن فرد استادے، مقتدائے وقت، قاضی شہاب الدین است، رحمۃ اللہ علیہ، گویند شہرتے و قبولیتے

وہ مرد آزاد، وہ فرد زمانہ، مقتدائے وقت قاضی شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ، کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو مقبولیت ان کو عطا فرمائی تھی،

[1] اخبار الاصفیاء، ورق ۶۰ قلمی [2] سبحۃ المرجان ص ۳۹ طبع بمبئی [3] خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۳۹۶ مطبوعہ ثمر ہند لکھنؤ۔

کہ حق تعالیٰ او را عطا کردہ ہیچ کس را از اہل زمان او نکردہ[1]	ان کے اہل زمانہ میں سے کسی کو نہیں دی تھی۔

صاحب تجلی نور شاہ عبد الحق صاحب کے الفاظ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

پیش او جملہ علوم حاضر، واو بجمیع علوم ماہر بود، ازیں جہت ملک العلماء ملقب گشت[2]	ان کے سامنے تمام علوم مستحضر ہوتے تھے اور وہ تمام علوم میں ماہر تھے، اسی لیے ان کو ملک العلماء کا لقب دیا گیا۔

سب سے آخر میں صاحب نزہۃ الخواطر نے ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

الشیخ الامام الکبیر العلامۃ قاضی القضاۃ ملک العلماء..... کان غایۃ فی الذکاء وسیلان الذہن وسعۃ الادراک وقوۃ الحفظ وشدۃ الانہماک فی المطالعۃ والنظر فی الکتب لایکاد نفسہ تشبع من العلم ولاتروی من المطالعۃ ولاتمل من الاشتغال ولاتکل من البحث[3]	شیخ، امام کبیر، علامہ قاضی القضاۃ ملک العلماء، ذکاوت وتیزی ذہن میں درجۂ کمال رکھتے تھے، سرعت فہم، قوت حافظہ، مطالعہ میں انہماک اور کتب بینی سے ان کو سیری وسیرابی نہیں ہوتی تھی، اور نہ علمی مشاغل اور بحث ونظر سے کبھی تھکتے اور گھبراتے تھے۔

آیندہ سطور میں اسی قدوۂ علمائے روزگار، زبدۂ فضلائے ہر دیار، امام روزگار، ہمام دیار، جامع علوم ظاہری وباطنی، صدر العلماء، بدر الفضلا، استاذ الشرق والغرب، عالم ربانی،

[1] مشکوٰۃ النبوت ص ۲۳۱ قلمی [2] تجلی نور ج ۲ ص ۳۲ [3] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۹

نعمان ثانی، علوم ظاہری میں طاق، رموز باطنی میں شہرۂ آفاق، مقتدائے وقت، مقبول خاص وعام، ماہر جملہ علوم، مرشد، محقق، مصنف ملک العلماء، قاضی القضاۃ، مخدوم شیخ شہاب الدین دولت آبادی کا ذکر مقصود ہے جس نے مدرسہ کی شورش میں خانقاہ کا سکون اور خانقاہ کی خاموشی میں مدرسہ کا ہنگامہ برپا کیا۔

نام ونسب اور آبائی وطن آپ کا نام احمد، لقب شہاب الدین اور والد کا نام عمر، لقب شمس الدین ہے، والد کے لقب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے مشاہیر علماء میں تھے، حیرت کی بات ہے کہ ہندوستان کے ملک العلماء کا نام ونسب بھی تذکرہ نگاروں نے پورا نہیں لکھا ہے، اور کسی کتاب میں سلسلۂ نسب نہیں ملتا، کشف الظنون میں "شہاب الدین احمد بن شمس الدین ابن عمر الہندی الدولۃ آبادی" اور دوسری جگہ یوں ہے "شہاب الدین احمد بن عمر"[1] سبحۃ المرجان میں ہے "شہاب الدین بن شمس الدین بن عمر الزاولی الدولۃ آبادی"[2] اخبار الاصفیاء میں یوں ہے "شہاب الدین بن عمر الزاولی الدولت آبادی الغزنوی"[3] اور نزہۃ الخواطر میں ہے "احمد بن عمر الزاولی، قاضی القضاۃ، ملک العلماء شہاب الدین بن شمس الدین الدولۃ آبادی"[4]۔ ہماری تحقیق میں آپ کا نام شہاب الدین احمد بن شمس الدین عمر ہے، بعض کتابوں میں جو شمس الدین کے بعد "بن عمر" ہے، اسے صرف "عمر" ہونا چاہیے۔

زاولی اور غزنوی کی نسبت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا آبائی وطن زابلستان کا شہر غزنیں تھا، تاریخ فرشتہ میں اس کی تصریح موجود ہے، "اصل او از غزنین ست"[5]۔ زابل یا زابلستان ایک وسیع وعریض علاقہ کا نام ہے، جو بلخ اور طخارستان کے جنوب میں واقع ہے، اس کو زابل یا ذابلستان بھی کہتے تھے[6]، غزنین یا غزنہ اسی کا دار السلطنت تھا، غزنیں

[1] ج ۱ ص ۸۶ و ۵۰۰ [2] طبع الفرہ ص ۳۹ [3] ورق ۹۰ [4] ج ۳ ص ۲۰ [5] ج ۲ ص ۳۰۶ [6] معجم البلدان ج ۴ ص ۳۶ طبع مصر

اپنے زمانہ کا سب سے بڑا شہر تھا جو خراسان اور ہندوستان کے درمیان حد فاصل تھا[1]، آج کل یہ شہر افغانستان میں واقع ہے۔ زاولی اسی زابلستان یا زابل کی طرف نسبت ہے، جس میں با، کو واؤ سے بدل دیا گیا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حضرت عبد الرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے ۳۰ھ میں بحستان کی فتوحات کے سلسلہ میں مقام بست کے بعد زابل کو صلح و معاہدہ کے ذریعہ فتح کیا تھا، مگر معاہدہ کے شرائط نرم تھے، اس لیے تھوڑے ہی دنوں کے بعد مقامی باشندوں نے بغاوت اور سرکشی اختیار کی تو حضرت عبد الرحمٰن بن سمرہؓ نے رخج کی فتح کے بعد اسے دوبارہ فتح کیا، اس مرتبہ بہت سے قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے[2]، اس کے بعد زابلستان بھی عجم کے دیگر ممالک کی طرح اسلامی قلمرو میں آگیا، اس کا مرکزی شہر غزنین سلطان محمود غزنوی اور دوسرے سلاطین غزنویہ کے دور میں بغداد و قرطبہ کی ہمسری کرتا تھا، جہاں عالم اسلام کے ہر طبقہ کے باکمال علماء و فضلاء موجود تھے، بغداد کے بعد غزنین مدتوں ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون کا مورد و مصدر رہا، اور جہاں کے بہت سے باکمال خاندان اور افراد نے یہاں آکر دہلی کو دوسرا غزنین بنا دیا۔

آباء و اجداد غزنین سے دہلی میں

ان ہی غزنین سے ہندوستان آنے والوں میں ملک العلماء قاضی شہاب الدین کا خاندان بھی تھا۔ یہ خاندان کس زمانہ میں یہاں آیا؟ یہ معلوم نہیں ہوسکا، سلطان شہاب الدین غوری کے قطب الدین ایبک کو ہندوستان میں اپنا نائب مقرر کرنے کے بعد سے غزنین اور دہلی کا علمی و ثقافتی رشتہ قائم ہوگیا تھا، اور وہاں کے ارباب علم و فن یہاں آنا شروع ہوگئے تھے، ہوسکتا ہے کہ اسی دور میں قاضی صاحب کے آباء و اجداد بھی یہاں آئے ہوں یا اسکے

[1] معجم البلدان ج ۴ ص ۲۸۹ [2] فتوح البلدان ص ۳۸۶ و ۳۸۸ طبع مصر

بعد اس پر آشوب دور میں ہزاروں خاندان کی طرح اس خاندان نے بھی غزنین کو خیرباد کیا ہو جب کہ وسط ایشیاء کا امن و امان منگولوں کی غارت گری سے ختم ہو چکا تھا، چنگیزی فتنہ کی ابتدا ساتویں صدی کے شروع میں ۶۱۶ھ سے ہوئی اور ۶۵۰ھ کے حدود تک پورا عالم اسلام اس آگ میں جلتا رہا، مگر یہ آگ سندھ تک آکر رک گئی تھی، اور ہندوستان اس سے محفوظ رہا تھا، غالب گمان ہے کہ اسی پر آشوب زمانہ میں یہ خاندان بھی دہلی میں آکر آباد ہوگیا تھا، اور قاضی صاحب کے تمام تذکرہ نگاروں کی تصریح کے مطابق ان کی پیدائش اور نشو و نما دولت آباد اور دہلی میں ہوئی حتی کہ موجودہ صدی کے تذکرہ نگار صاحب تذکرہ علمائے ہند نے بھی لکھا ہے کہ "در دولت آباد متولد شد" (ص ۸۰)، مگر معلوم نہیں کیسے انھوں نے قاضی صاحب کے نواسے شیخ صفی الدین بن شیخ نصیر الدین کے ذکر میں لکھ دیا ہے کہ قاضی صاحب بذات خود غزنین سے ہندوستان آئے۔

بالجملہ شیخ نظام الدین جد صاحب ترجمہ با پسر خود نصیر الدین از مرز بوم غزنین باتنے چند در حادثہ ہلاکو خاں بعہد دولت علاء الدین خلجی در ہندوستان نہاد و مدتے در دہلی قیام ورزید و در فترات مذکور قاضی شہاب الدین بن شمس الدین دولت آبادی ہم از اں دیار داد و دہلی گشت و بزمرۂ تلامذۂ قاضی عبد المقتدر مباہی گردید (تذکرۂ علمائے ہند ص ۹۶ طبع نولکشور)

شیخ نظام الدین اپنے صاحبزادے اور دوسرے چند لوگوں کے ساتھ ہلاکو خاں کے فتنہ میں غزنین سے ہندوستان چلے آئے، یہ علاء الدین خلجی کا عہد سلطنت تھا، اور ایک مدت تک دہلی میں قیام کیا، ان ہی حوادث میں قاضی شہاب الدین بن شمس الدین دولت آبادی بھی اس دیار سے دہلی آئے اور قاضی عبد المقتدر کے شاگردوں کے زمرہ میں داخل ہوگئے۔

جو تمام تذکرہ نویسوں کے بیانات اور خود مصنف کی تصریح کے بھی خلاف ہے، صحیح یہ ہے کہ قاضی صاحب شہاب الدین نہیں بلکہ ان کے آباء و اجداد میں سے کوئی بزرگ ہندوستان آئے تھے، اور قاضی صاحب کی ولادت اور نشو و نما یہیں دولت آباد میں ہوئی تھی، اس بارہ میں دو رائیں ہیں کہ یہ مقام دہلی سے متعلق تھا یا دکن کا دولت آباد تھا؟ پہلا قول یہ ہے کہ دولت آباد دکن مراد ہے، تاریخ فرشتہ میں تصریح ہے کہ "در دولت آباد دکن نشو و نما یافت" (ج ۲ ص ۳۰۶) دوسرا قول یہ ہے کہ دولت آباد دہلی میں پیدا ہوئے، اخبار الاصفیا میں ہے "زادگاہ او دولتاباد دہلی ست" (ورق ۶۰) سبحۃ المرجان میں ہے "ولد القاضی بدولت آباد دہلی (ص ۳۹) نزہۃ الخواطر میں بھی یہی ہے (ج ۳ ص ۲۰) تذکرہ علمائے ہند میں صرف دولت آباد ہے (ص ۸۸)۔ یہ عجیب بات ہے کہ قاضی صاحب کے کسی تذکرہ نویس نے ان کی نسبت دہلوی اور جونپوری نہیں لکھی ہے، حالانکہ ان کی پوری زندگی ان ہی دونوں مقامات میں گذری ہے۔

سنہ ولادت کسی کتاب میں درج نہیں ہے، اور نہ اس کی طرف کوئی اشارہ ملتا ہے، البتہ تذکرہ علمائے ہند (ص ۷) اور نزہۃ الخواطر (ج ۳ ص ۳۱) میں ہے کہ قاضی صاحب کے نواسے شیخ صفی الدین کے صاحبزادے شیخ ابو المکارم اسمٰعیل کی ولادت ۱۲ ربیع الثانی ۷۸۹ھ میں ہوئی، اگر شیخ ابو المکارم اسمٰعیل اپنے والدین کی پہلی اولاد تھے تو ان کے والد شیخ صفی الدین کے نانا قاضی شہاب الدین کی عمر ۷۸۵ھ میں کم و بیش چالیس سال کی رہی ہوگی، اس حساب و اندازہ سے خود قاضی صاحب کی ولادت حدود ۷۴۵ھ میں ہوئی ہوگی۔

پیدائش اور تعلیم

قاضی صاحب کی پیدائش بہرحال آٹھویں صدی کے وسط میں ہوئی تھی، اس زمانہ میں دہلی میں تغلق خاندان حکمراں تھا، مگر اندرونی بدانتظامی کی وجہ سے ملک میں جگہ جگہ نئی نئی طاقتیں سر اٹھا رہی تھیں، چنانچہ ۷۴۸ھ میں دکن میں بہمنی سلطنت کا قیام ہوا، ۷۹۳ھ

میں سلاطین گجرات نے اپنی حکومت کھڑی کر لی، ۷۹۶ھ میں جونپور میں شاہان شرقیہ نے شرقی سلطنت قائم کر لی، اسی طرح ۷۷۱ھ میں کشمیر میں الگ حکومت بن گئی، اور ہندوستان میں یہ ابتری پھیلی ہوئی تھی کہ وسط ایشیا سے ۷۷۱ھ میں امیر تیمور گورگاں کی فتوحات کا ہلاکت خیز سیلاب امنڈا اور دیکھتے ہی دیکھتے سمرقند، ماوراء النہر، ترکستان، خوارزم، کاشغر، بلخ، خراسان، مازندران، طبرستان، غزنین، استرآباد وغیرہ میں تباہی مچاتا ہوا شام و حلب میں داخل ہوگیا، اور ۸۰۰ھ میں یہ سیلاب سندھ اور پنجاب کی طرف بڑھا، اور قتل و غارت کرتا ہوا جمادی الاولیٰ ۸۰۱ھ میں دہلی میں پہنچ گیا، اور امیر تیمور نے دہلی میں قتل و غارت کا ایسا بازار گرم کیا کہ سلطان ناصر الدین اس کی تاب نہ لاکر گجرات چلا گیا، اور اس کے وزیر اقبال خاں نے برن میں پناہ لی۔

اس پر آشوب دور میں بھی دہلی کی علمی و دینی رونق بدستور قائم رہی، دانشوروں کی تعلیم گاہیں اور مشائخ کی خانقاہیں پوری دل جمعی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھیں، مگر ۸۰۱ھ میں تیمور کی تباہ کاریوں سے یہ مدرسے بھی ویران اور خانقاہیں سونی ہوگئیں، دہلی کی علمی و دینی اور روحانی محفلیں اجڑ اجڑ کر جونپور، گجرات، دکن اور کشمیر وغیرہ میں جمنے لگیں اور علماء و فضلاء اور مشائخ قافلہ در قافلہ دہلی سے باہر جانے لگے، اسی پر آشوب زمانہ میں قاضی صاحب نے آنکھ کھولی اور دہلی میں نشو و نما اور تعلیم پائی۔

دہلی میں اودھ کے علماء و مشائخ

آپ کے بچپن اور طالب علمی کے زمانہ میں اگرچہ دہلی کا امن و امان اور سکون و اطمینان خواب و خیال ہو رہا تھا، پھر بھی وہاں ہر علم و فن کے سرآمدگان روزگار موجود تھے، خاص طور سے دیار پورب کے اودھی علماء و مشائخ دہلی میں علمی و روحانی فضا قائم کیے ہوئے تھے، اور کفرستان اودھ کے ان ایمانی چراغوں سے شہر کے بام و در روشن تھے،

قاضی صاحب نے ان ہی اودھی علماء و مشائخ کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہو کر ان سے اکتساب فیض کیا، اس وقت شیخ الاسلام فرید الدین شافعی اودھی ——— کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ دہلی کی مسند درس اور بزم ارشاد و تلقین سے علوم و معارف کی سوغات تقسیم کر رہے تھے، ان ہی بزرگوں سے قاضی صاحب نے تحصیل و تکمیل کی، یہاں ان کا مختصر ذکر مناسب ہوگا۔

شیخ الاسلام فرید الدین اودھیؒ آٹھویں صدی میں اودھ کے شیخ الاسلام تھے، ان کا شمار اس دور کے علماء میں ہوتا تھا، اودھ سے دہلی تک ان کے علم و فضل کی دھوم تھی، اور تشنگان علم و معرفت اس آب حیات سے سیراب ہو رہے تھے، ان کے تلامذہ و مسترشدین میں اودھ کے دو بزرگ شیخ شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی اور شیخ علاء الدین نیلی اودھی خاص طور سے شہرت رکھتے تھے۔

شیخ شمس الدین محمد یحییٰ نے شیخ الاسلام فرید الدین سے اکتساب فیض کرنے کے ساتھ دہلی میں مولانا ظہیر الدین بھکریؒ کی شاگردی اختیار کی اور پھر پوری زندگی درس و تدریس، ارشاد و تلقین اور عبادت و ریاضت میں گذار دی، حضرت نظام الدین اولیا کے اجل خلفاء میں سے تھے، ان کی تصانیف میں شمس المعارف اور شرح مشارق الانوار کے نام ملتے ہیں، ان کی علمیت و مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ

از مشاہیر علماء دہلی گشت، بیشتر مردم	شیخ شمس الدین دہلی کے مشاہیر علماء میں سے
شہر در تلمذ بوے انتساب می کردند و بآن	ہو گئے اور شہر دہلی کے اکثر علماء نے ان سے
نسبت مفتخر و متبجح بودند[1]	نسبت تلمذ کر کے اسے اپنے فخر و خوشی کا باعث سمجھا۔

زندگی بھر مجرد رہے، علماء و مشائخ دونوں ان کا احترام کرتے تھے، ان کے شاگرد خاص

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۸۶

شیخ نصیر الدین محمود اودھی نے ان کی علمیت کا اظہار اس شعر میں کیا ہے:

سألت العلم من احياك حقا   فقال العلم شمس الدين يحيىٰ

شیخ شمس الدین سلطان محمد بن تغلق کے عہد ۷۴۷ھ میں دہلی میں فوت ہوئے۔ ان کے تلامذہ میں شیخ نصیر الدین محمود بن یحییٰ بن عبد اللطیف اودھی علم و معرفت کی بزم میں "چراغ دہلی" کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں، بڑے پایہ کے عالم و مدرس ہیں، قاضی عبد المقتدر سے ابتدائی تعلیم پائی تھی، پھر شیخ شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی سے علمی و روحانی فیوض و برکات حاصل کر کے دہلی میں مولانا عبد الکریم شروانی اور مولانا افتخار الدین گیلانی کی شاگردی اختیار کی، اور چالیس سال کی عمر میں اودھ سے دہلی چلے گئے اور حضرت نظام الدین اولیاؒ سے خلافت حاصل کی، شیخ نصیر الدین اور ان کے تلامذہ علوم شرعیہ کی تعلیم و تدریس میں خاص شہرت رکھتے تھے، ان کی اس خصوصیت کا ذکر شاہ عبد الحق صاحب نے قاضی عبد المقتدر کے حال میں کیا ہے:-

دائم درس می گفت و بافادۂ علم مشغول بود	قاضی عبد المقتدر ہمیشہ درس و تدریس میں مشغول
و طریقۂ شیخ نصیر الدین محمود و اکثر خلفائے	رہتے تھے، اور شیخ نصیر الدین محمود اور انکے
ایشان ایں بود، وصیت او بطالبان	اکثر خلفاء کا یہی طریقہ تھا، وہ طالب علموں
اشتغال علم و حفظ شریعت او، گفتے	کو علم میں مشغولیت اور شریعت کی حفاظت
فکر در یک مسئلہ شرعی نفضل دارد بر ہزار	و پاسداری کی تاکید کیا کرتے تھے، ان کا قول
رکعت کہ متوجب تعجب در یا کنند[1]	تھا کہ ایک شرعی مسئلہ میں غور و فکر کرنا ایسی
	ہزار رکعت نفل نماز سے افضل ہے جس میں تشابہ رہا ہو۔

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۴۸

شیخ نصیر الدین ۷۵۷ھ میں فوت ہوئے، ان کے تلامذہ میں قاضی عبدالمقتدر شریحی کندی، مولانا خواجگی، شیخ محمد بن یوسف گیسو دراز، شیخ علاء الدین سندیلوی اور شیخ علاء الدین الندی وغیرہ ہیں، ان میں قاضی عبد المقتدر، اور مولانا خواجگی دونوں بزرگ قاضی شہاب الدین کے اساتذہ و شیوخ میں ہیں۔

مولانا قاضی عبد المقتدر بن رکن الدین شریحی کندی تھانیسر میں پیدا ہوئے اور دہلی میں پروان چڑھے، انھوں نے شیخ الاسلام فرید الدین اودھی کے خرمنِ علم و فضل سے خوشہ چینی کی اور ان کے تلمیذ رشید شیخ شمس الدین محمد بن یحییٰ اودھی سے ابتدائی کتبِ درسیہ پڑھیں، جس زمانہ میں قاضی عبدالمقتدر ان سے تعلیم حاصل کر رہے تھے، ان کے تلمیذ شیخ نصیر الدین محمود اودھی کی خدمت میں آیا جایا کرتے تھے، اور بعض علمی مسائل پر ان سے گفتگو کرتے تھے، جس سے شیخ نصیر الدین کو قاضی عبدالمقتدر کی جودت طبع اور علمی صلاحیت و قابلیت کا اندازہ ہوا، اور انھوں نے ان کو تحصیلِ علم کی طرف خصوصی توجہ دلائی، بعد میں قاضی عبد المقتدر نے ان سے تفسیر کشاف اور اصول بزدوی پڑھی، اور ان ہی کی بیعت و خلافت سے اپنی روحانی بزم سجائی، قاضی عبدالمقتدر اپنے دور میں دہلی کی جامع ترین شخصیت تھے، علوم نقلیہ و عقلیہ کے ماہر تھے، ادب، فصاحت و بلاغت اور جودت طبع میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، ان کا قصیدہ، نعتیہ لامیہ جو قصیدۂ لامیۃ العجم کے معارضہ میں ان کی قادر الکلامی، فصاحت، بلاغت، ادبیت اور شاعری کے ذوق لطیف پر شاہد عدل ہے، جس کے دو ابتدائی اشعار یہ ہیں:

یاسائق الظعن فی الاسحار والاصل   سلم علی دار سلمی وابک ثم سل

عن الظباء التی من دابها ابداً   صید الاسود بحسن الدل والنجل

قاضی عبدالمقتدر نے اپنے استاد کے طریقہ پر پوری زندگی علوم شرعیہ اور فنون ادبیہ

و عقلیہ کی تدریس میں بسر کی اور ۷۹۱ھ میں دہلی میں فوت ہوئے، قاضی شہاب الدین کو انکی نگاہ کیمیا اثر نے ملک العلماء بننے کی استعداد بخشی، اور ان کے دوسرے اساتذہ و شیوخ کے مقابلہ میں قاضی عبد المقتدر نے ان پر خاص توجہ کی،

شیخ نصیر الدین اودھی کے دوسرے شاگرد و خلیفہ مولانا خواجگی دہلویؒ ہیں جو قاضی صاحب کے دوسرے مربی و مرشد اور معلم ہیں، واقعہ یہ ہے کہ قاضی صاحب کی شخصیت سازی میں ان دونوں استاذوں کی توجہ نے بڑا کام کیا ہے، اور اس میں کوئی تیسرا نظر نہیں آتا، مولانا خواجگی نے دہلی کی علمی فضا میں آنکھ کھولی، اور شیخ نصیر الدین سے فیض اٹھایا، اور مولانا معین الدین عمرانیؒ سے بھی تعلیم حاصل کی جو اپنے وقت میں فقہ، اصول فقہ، نحو، عربیت، علم کلام، منطق اور فلسفہ میں دہلی کے مشہور عالم و مدرس مانے جاتے تھے، فراغت کے بعد اپنے استاذ و شیخ نصیر الدین اور ان کے بزرگوں کے طریقہ پر درس و تدریس میں مشغول ہوگئے، اور اسی میں دہلی میں پوری زندگی بسر کردی، اور آخر میں تیموری فتنہ میں دہلی کی تباہی سے پہلے ہی کالپی چلے گئے، اور وہیں ۸۰۹ھ میں فوت ہوئے، اس سفر میں قاضی شہاب الدین بھی ان کے ساتھ تھے، مگر کچھ دنوں کے بعد انھوں نے جونپور کا رخ کیا۔

قاضی صاحب کے اساتذہ میں صرف مولانا عبدالمقتدر اور مولانا خواجگی کے نام لیے جاتے ہیں، یہ دونوں شیخ نصیر الدین محمود اودھی چراغ دہلی کے واسطے سے شیخ الاسلام فرید الدین اودھی اور ان کے تلمیذ خاص شیخ شمس الدین اودھی کے علمی و روحانی سلسلہ کے ترجمان اور نمایندے تھے، نیز قاضی صاحب مولانا خواجگی کے اجل خلفاء میں سے تھے، اس اودھی سلسلۂ علم و معرفت کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں علوم شرعیہ اور فنون نقلیہ و عقلیہ کا رواج عام تھا، اور اس کے مشائخ و علماء درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کی خدمات

بھی انجام دیتے تھے، اس لیے قاضی صاحب پر بھی یہی رنگ غالب ہوا، اور انھوں نے مشیخت سے زیادہ علمیت کے انداز میں زندگی بسر کی، [illegible] کے بعد جب جونپور آئے تو یہاں حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ متوفی [illegible] کی صحبت و خلافت نصیب ہوئی، ان میں بھی علم و معرفت دونوں کا اجتماع تھا، لیکن علمیت کے مقابلہ میں مشیخت کا رنگ غالب تھا، علوم اسلامیہ کے مختلف موضوعات پر ان کی تصانیف ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محدث، مفسر، فقیہ، مفتی، مورخ اور علوم عقلیہ کے بھی بڑے عالم تھے، اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

مولانا خواجگی اور قاضی عبد المقتدر سے تلمذ

قاضی شہاب الدین نے سب سے پہلے مولانا عبد المقتدر کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، اور استاذ کی پہلی ہی نگاہ کیمیا اثر نے شاگرد کے مس خام کو کندن بنا دیا، وہ اپنے اس شاگرد کے علمی ذوق و شوق، طلب و جستجو اور قابلیت و استعداد کو فخریہ انداز میں بیان کرتے تھے،

پیش من طالب علمی می آید کہ پوست او	میرے پاس ایک ایسا طالب علم آرہا ہے
علم، و مغز او علم، و استخوان او علم است	جس کا چمڑا، ہڈی اور مغز سب علم ہی علم
و آں طالب علم قاضی شہاب الدین	ہے، اور اس سے ان کی مراد قاضی
علیہ الرحمہ می خواست،[1]	شہاب الدین تھے،

استاد کے ان تاثرات سے شاگرد کی علمی لگن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اس بنا پر شفیق استاد ہونہار شاگرد کی تعلیم کے ساتھ اس کی تربیت کا بھی پورا خیال رکھتے تھے، اس سلسلہ میں اخبار الاخیار نے مناقب الصدیقین کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ قاضی شہاب الدین کو کہیں سے تھوڑا سا سونا مل گیا، جسے وہ بحفاظت گھر لے گئے، اور تنہائی

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۹۱ ذکر قاضی عبد المقتدر

میں جا کر اپنی والدہ سے کہا کہ اسے گھر کے اندر کہیں دفن کر دینا چاہیے، مولانا عبد المقتدر کو اس واقعہ کی خبر لگ گئی، چنانچہ جب قاضی صاحب درس میں حاضر ہوئے تو ان سے فرمایا

شما در خیال گور کردن زر ید، با علم	تم سونا دفن کرنے کے خیال میں ہو بھلا
کجا بر دازید[1]	علم کے ساتھ یہ کیسے نبھ سکتا ہے۔

قاضی صاحب کی طالبعلمی کے زمانے کے یہی دو واقعات ملتے ہیں، جن سے طلب علم میں ان کے انہماک کا اندازہ ہوتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کے معاشی حالات اچھے نہ تھے، اس واقعہ کے سلسلہ میں ان کی والدہ ماجدہ کا ذکر آگیا ہے، مگر والد ماجد کا ذکر نہیں ملتا، یہ بھی معلوم نہیں کہ اپنے ہونہار فرزند کی تعلیم و تربیت میں ان کا کتنا ہاتھ تھا، اور وہ اس وقت بقید حیات بھی تھے یا نہیں؟ (باقی)

---

[1] اخبار الاخیار ص ۱۴۱

حیات شبلی

(مولانا سید سلیمان ندویؒ کی زندگی کا آخری کارنامہ)

یہ نو سو ۹۰۰ صفحوں کی ضخیم کتاب صرف اس عہد کے ایک جامع گوناگوں کمالات بزرگ کی سوانحعمری ہی نہیں بلکہ درحقیقت مولانا شبلی کے دور تک کے ہندوستانی مسلمانوں کے پچاس سالہ علمی، ادبی، سیاسی تعلیمی، مذہبی، ملی و قومی تحریکات و واقعات کی ایک مستند تاریخ بن گئی ہے، اسی سلسلہ میں متن اور حاشیہ دونوں میں بہت سے ایسے اصحاب علم و فن کے مختصر حالات و سوانح بھی آگئے ہیں، جنکا اس عہد کے سمجھنے کے لیے جاننا ضروری تھا، شروع میں ایک دیباچہ ہے، اس کے بعد ایک مفصل مقدمہ ہے جس میں دیار مشرق میں علوم اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت و خدمت کی تاریخ کے ساتھ ضمناً ہر عہد کے مشہور اکابر علماء کے حالات بھی آگئے ہیں، اسی کے ذیل میں سلاطین شرقیہ جونپور کے عہد کے مشہور و ممتاز ترین عالم قاضی شہاب الدین دولت آبادی کا ذکر بھی اردو میں پہلی مرتبہ آیا ہے، جس کی تفصیل اس مضمون میں ہے

قیمت :- ۱۶/۵ روپے

غالبؔ کی وطنیت پر ایک نظر

از سید صباح الدین عبدالرحمن

کلام غالب کو مقبول بنانے میں نظامی بدایونی کی شرح کا بھی بڑا حصہ ہے، اسکے اب تک کئی اڈیشن نکل چکے ہیں، اس کے پانچویں اڈیشن کی اہمیت اُس وقت بڑھ گئی جب اس میں ڈاکٹر سید محمود بار ایٹ لا کا ایک مقدمہ بھی منسلک کر دیا گیا، یہ پانچواں اڈیشن ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا، لیکن ڈاکٹر صاحب کا مقدمہ بھی ۱۹۱۹ء کا لکھا ہوا ہے، وہ ابھی تک بقید حیات ہیں، اس وقت ان کی عمر تقریباً اسّی سال کی ہوگی، وہ اپنی طالب علمی سے لیکر اب تک مختلف قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں مشغول ہیں، آل انڈیا نیشنل کانگریس کی ممبری سے ترقی کر کے اس کے آل انڈیا سکریٹری بھی ہوئے، پھر صوبہ بہار کے وزیر تعلیم ہوئے، اور آخر میں حکومت ہند کے وزیر مملکت امور خارجہ بھی رہے، ان سیاسی دلچسپیوں کے ساتھ ان کو تاریخ اور شعر و ادب کا بھی بڑا اچھا ذوق ہے، وہ بھی ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کی طرح غالب کے پرستار ہیں، اسی پرستاری میں ان پر ایک مقالہ لکھا جس کو نظامی بدایونی نے اپنی شرح کلامِ غالب کے ساتھ بڑی ممنونیت سے شائع کیا، ڈاکٹر صاحب عبدالرحمن بجنوری کے بڑے معترف ہیں، لکھتے ہیں:

"اس نئے دور میں مغربی تعلیم نے ہندوستان میں ایک ایسا نوجوان پیدا کیا تھا، جس نے مرزا غالب کی عظمت حقیقی معنوں میں پہچان لی تھی، اور جو غالب کے

کلام کو ایسے حسن معانی کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کرنے والا تھا جس سے فلسفی، صوفی، شاعر اور سائنس داں سب ہی متحیر رہ جاتے، آہ عبدالرحمن! عمر نے تیرے ساتھ وفا نہ کی، تو ملک و قوم کی یہ عظیم الشان خدمت انجام نہ دے سکا۔" (ص ۱۰)

اور پھر بجنوری کے تبصرے سے متاثر ہو کر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ کون شخص ہے جو دیوان غالب کے مطالعہ کے وقت یہ نہیں محسوس کرتا کہ اس کا لکھنے والا حقیقی ماہر فن ہے، اور شاعری خدا کی طرف سے اس کو ودیعت کی گئی تھی، اس کی شاعری کسبی نہیں...... اس کی ہستی ان چیدہ اور بزرگ تر خاصانِ خدا کے گروہ سے ہے، جن کا وجود ابدی ہے" (ص ۱۱)

اس کے بعد وہ غالب کی شیریں بیانی، فصاحت، بلاغت، بلندی خیال، ذکاوت، تعمق خیال، وسعتِ نظر، عالمگیر ہمدردی و غمخواری، انسان اور اس کے خصائل سے گہری واقفیت، مشکل گوئی کے ساتھ طرز ادا کی سادگی، تشبیہوں کی جدت، استعاروں کی طرفگی، بلند پروازی کے ساتھ شوخی وغیرہ کی تعریف کرتے اور ان کی مثالیں دیتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ

"غالب بے شک انسانی ہستی کا اعلیٰ مفسر ہے اور اس کا کلام ہر زمانہ میں انسان کے دلی جذبات و خیالات کی تفسیر کر کے لوگوں کو خوش کرتا رہیگا، اس ہیچمیرز کی رائے میں غالب شیلی کی پرواز، کیٹس کی فصاحت، گوئٹے کی عمیق النظری، شلر کی بلند خیالی، فرنس ٹامسن کے تخیل، مومن کے درد، سودا کی ظرافت اور میر کی سادگی کا مجموعہ ہے۔" (ص ۴۲)

ناظرین کو اس سے اتفاق ہو یا نہ ہو، لیکن غالب کو اپنی زندگی میں شکایت تھی کہ ان کی قدر دانی نہیں ہوئی جس سے یہ ظاہر ہے کہ وہ سرسید، صہبائی اور شیفتہ کی غیر معمولی قدر دانی سے بھی زیادہ کے متوقع رہے، وہ زندہ ہوتے تو معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب

کی مذکورۂ بالا داد کو کس نظر سے دیکھئے۔

ڈاکٹر سید محمود نے اپنے اس مقدمہ میں ایک ایسی نئی بات کہی ہے جو ان سے پہلے کسی نے نہیں کہی تھی، ان کو غالب کی غزلوں کے بعض اشعار میں ان کے زمانہ کے خوں چکاں سیاسی واقعات کی عکاسی نظر آتی ہے، اس کو ناظرین محض حسن اتفاق یا ڈاکٹر صاحب موصوف کی ذہانت جو چاہیں سمجھیں، انھوں نے اپنے مقدمہ میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستانیوں کی زندگی کا خاتمہ ایک قوم کی حیثیت سے ہو چکا تھا، سیاست دانوں کی طرح غالب نے بھی اپنے گہرے احساس سے اس کو محسوس کیا، اور پردہ و پیرایہ میں اس کا اظہار یہ کہکر کیا:

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

اسی بات کو دوسرے انداز میں اس طرح کہتے ہیں:

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

۱۸۵۷ء میں دلی تباہ ہوئی، بندگانِ خدا بے خانماں ہوئے، شرفا کے مکان ویران اور برباد کر دیے گئے، پورا شہر صحرا ہو گیا، تو غالب اس کی تصویر اس طرح پیش کرتے ہیں:

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے، ان کو دیکھ کر غالب نے کہا:

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

دل نہیں ورنہ دکھاتا تجھ کو داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

ہیں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

غالب نے اپنے اہل وطن کو ان مصائب سے عبرت حاصل کرنے کی تلقین یہ کہکر کی تھی:

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

انگریزوں نے دہلی فتح کی تو اس وقت بڑی افراتفری تھی، نہ کوئی قانون تھا نہ قاعدہ اور نہ نظیر، کوئی کہیں فریاد نہیں کر سکتا تھا، اس کی شکایت غالب اس پیرایہ میں کرتے ہیں:

وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کی تہذیب جس طرح مٹائی، اس کا اثر غالب کے دل پر بھی ہوا، اور انھوں نے پوشیدہ طور پر اس کا دردناک مرثیہ لکھا جو حقیقتاً دل کو ہلا دینے والا ہے، اور یہ ہندوستان کی مٹی ہوئی عظمت کو یاد دلا کر خون کے آنسو رلواتا ہے، اس کے چند اشعار یہ ہیں:

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ایک دوسری جگہ شاہی خاندان کی تباہی کا ذکر پوشیدہ درد دل کے ساتھ اس طرح کرتے ہیں۔

گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

غالب کے دیوان میں جگہ جگہ ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے ان کے حبِ الوطنی کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً وہ اپنے ملک کی بدنصیبی پر یہ کہکر روتے ہیں:

ہندوستان سایۂ گل پایۂ تخت تھا　　جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ

ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے　　عرضِ فضائے سینۂ دردِ امتحاں نہ پوچھ

دہلی اور لکھنؤ کی تباہی کے دل خراش واقعات پر بھی اس طرح آنسو بہائے:

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں　　دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

ملک کی کھوئی ہوئی آزادی پر ان کے آنسو کبھی نہیں تھمے، اسی لیے فرماتے ہیں:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں　　لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

جوئے شیر آنکھوں سے بہنے دو کہ ہو شامِ فراق　　میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

اپنی ملکی آزادی کے جانے پر ہر چند صبر کرنا چاہتے تھے لیکن ضبط نہیں ہوا تو کہہ اٹھے:

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے　　میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

اسی غزل میں یہ بھی کہتے ہیں کہ حکومت ہی اصل میں قوموں کی زندگی کا باعث ہوتی ہے، اور جب کسی قوم کو حکومت حاصل ہو گئی تو گویا سب کچھ مل گیا، اور اس قوم میں زندگی آگئی۔

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا　　سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو انھوں نے ہندوستانیوں سے وعدہ کیا کہ ہندوستان کی حکومت ان کو رفتہ رفتہ دی جائے گی، یہاں تک کہ حکومت کی ساری ذمہ داری ان کے سپرد کر دی جائے گی۔ مرزا غالب اس پر بڑی حسرت و یاس کا اظہار اس پیرایہ میں کرتے ہیں:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک　　کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ　　دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب　　دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

پھر ہندو مسلمان کے اتحاد کی تلقین مسلمانوں کو اس طرح کرتے ہیں:

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال　　رہبر چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ڈاکٹر سید محمود نے غالب کی غزلوں کے اشعار میں ان کے سیاسی خیالات کی جو تعبیر کی ہے، اس سے ان کے دوستوں کو اتفاق نہیں تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ "اکثر صاحبان نے یہ اعتراض کیا کہ غالب سیاسی خیالات سے بے بہرہ تھے، ان کو ملکی اور قومی تباہی کا بالکل احساس نہ تھا"۔ ڈاکٹر صاحب کے عزیز دوست سید راس مسعود نے بھی ان کو لکھ بھیجا کہ غالب کی اکثر تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے انگریزوں اور انگریزی طرزِ حکومت کی بہت سی تعریفیں کی ہیں۔ ڈاکٹر سید محمود اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ کسی غیر ملکی حکومت یا طرزِ حکومت کی تعریف و توصیف کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ شاعر ملکی و قومی جذبات سے بے بہرہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ غالب زمانہ کے تقاضا اور اردو شاعری کے خاص طرزِ بیان کی وجہ سے اپنے ملکی و قومی جذبات صاف صاف الفاظ میں ظاہر کرنے سے معذور تھے، مجبوراً اپنے خیالات کا اظہار نہایت گہرے اور پوشیدہ معنوں میں کرتے رہے، جیسا کہ ایک خط میں ملک کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں"۔

اور پھر کہتے ہیں:

زبان اہل زباں میں ہے مرگ خاموشی — یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع

اور یہ بھی

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے — لے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

غالب کے اشعار کی مذکورۂ بالا سیاسی تعبیر پر بڑی نکتہ چینیاں ہوئیں، غزل کے اشعار کی خوبی یہ ہے کہ وہ حسب حال موقع بموقع پڑھے اور استعمال کیے جاتے ہیں، غالب کے زمانہ میں جو خونچکاں سیاسی واقعات ہوتے رہے، ان کی تطبیق غالب کے بہت سے اشعار سے کی جا سکتی ہے، لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ غالب نے یہ اشعار ملک کی زبوں حالی، ضائع شدہ قومی وقار، کھوئی ہوئی ملکی آزادی اور پھر آزادی کی تڑپ میں کہے، جن کو کہتے وقت یہ ساری باتیں ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ رہی ہونگی، لیکن ان کی غزل گوئی کی کرامتیں جہاں اور طرح سے دکھائی دیتی ہیں، وہاں سیاسی رنگ میں بھی دیکھی گئیں، مگر ڈاکٹر سید محمود کی تعبیرات پر جل کر یگانہ چنگیزی نے جو غالب کے مخالفین میں ہیں حسب ذیل رباعی بھی لکھ ڈالی:

تلوار سے مطلب نہ کٹھاڈ سے غرض — مومن سے سروکار نہ ٹانڈ سے غرض
رنگوں میں دم توڑتا ہے شاہ ظفر — غالب کو ہے اپنے حلوے مانڈے سے غرض

ڈاکٹر سید عبد اللطیف نے یہ لکھکر نکتہ چینی کی کہ ایک اور نقاد ڈاکٹر سید محمود بیرسٹر ایٹ لا ...... بدایونی نسخہ کے دیباچہ میں غالب کو ہندوستانی قومیت کا اوتار بنا دیتے ہیں، اس طرز کی تنقیدوں سے اردو داں طبقہ میں ایک قسم کی بد ذوقی پیدا ہو چلی ہے،

(غالب مصنفہ ڈاکٹر سید عبد اللطیف ص ۱۱، اردو ترجمہ)

آگے چل کر ڈاکٹر سید عبد اللطیف لکھتے ہیں کہ غالب کے قدر دانوں نے یہ بتانے کی

کوشش کی ہے کہ وہ بڑا وطن پرست تھا، اور اسلامی اقتدار کی تباہی سے اس کے دل پر بڑی چوٹ لگی، چنانچہ ذیل کے اشعار اس کے درد دل کے مظہر بیان کیے جاتے ہیں:

ہندوستان سایۂ گل پایہ تخت تھا — جاہ و جلال عہد وصالِ بتاں نہ پوچھ
ہر داغ تازہ اک دل داغ انتظار ہے — عرض فضائے سینہ درد امتحاں نہ پوچھ

گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج — قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ — تار نفس کمندِ شکار اثر ہے آج

جو شخص ان اشعار کو ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں کا ترجمان سمجھتے ہیں وہ شاید اس سے ناواقف ہیں کہ یہ غدر کے غالباً چالیس سال قبل لکھے گئے، ملاحظہ ہو دیوان غالب قلمی نسخہ بھوپال جو ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۱ء میں ترتیب دیا گیا۔ (غالب ص ۷۹-۸۰)

یگانہ اور ڈاکٹر سید عبد اللطیف تو غالب کے مخالفوں میں سے ہیں، اس لیے انکا ڈاکٹر سید محمود پر نکتہ چیں ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں، لیکن اکرام غالب کے پرستاروں میں ہیں، وہ بھی ڈاکٹر سید محمود کی رائے سے متفق نہیں، لکھتے ہیں کہ حال ہی میں مرزا کے چند مداحوں نے ان کے بعض اشعار سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ ان میں حب وطن کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا، حقیقتاً یہ خیال نہ صرف مرزا کے حالات زندگی اور ان کے فارسی کلام سے ناواقفیت کی وجہ سے پیدا ہوا بلکہ مرزا کی افتاد طبیعت کے غلط انداز پر مبنی ہے۔ مرزا بقول خود شہد کی مکھی نہیں تھے، گڑ کی مکھی تھے،...... جب غدر سے دو سال پہلے فیصلہ ہوا کہ بہادر شاہ کے بعد شاہی سلسلہ ختم کر دیا جائے اور اس کے جانشین کا خطاب شاہزادہ ہو تو مرزا کو شاہی سلسلہ کے ختم ہونے کا کوئی صدمہ نہیں ہوا — کوئی فکر تھا تو اپنے مستقبل سے متعلق اور انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں درخواستیں گذرانی شروع کر دیں کہ تمام دنیا

کے بادشاہوں کے درباری شاعر ہوتے ہیں، مجھے کیوں نہ کوئین پوئٹ گنا جائے، مرزا معاملہ فہم آدمی تھے، اور اپنے جذبات کو عقل کے تابع رکھتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہادر شاہ سے انکی دل بستگی کبھی بھی اتنی گہری نہیں ہوئی کہ وہ اس کی بربادی سے بے قرار ہو جاتے اور اگر ہوتے بھی تو اپنے سوا مرزا کس کو اس قدر اہم سمجھتے تھے کہ اس کے لیے آنسو بہاتے" (غالب نامہ ص ۱۴۶-۱۴۷)

یہ کہنا تو صحیح نہیں کہ غالب کو بہادر شاہ سے دلچسپی نہیں رہی، غالب کے حسب ذیل اشعار یا تو ان کی محض کذب بیانی پر محمول کیے جائیں یا ان کی راست گوئی سمجھی جائے جو ان کی سیرت کا ایک اہم جزو بتایا جاتا ہے۔

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ	اے جہاں دارِ آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں	تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی	ہوئی میری وہ گرمیِ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز	روشناسِ ثوابت و سیار
گرچہ از روئے ننگ بے ہنری	ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی	جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں	بادشہ کا غلام کار گزار
خانہ زاد اور مرید اور مداح	تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ گزار

پھر اسی قطعہ میں یہ بھی کہتے ہیں :-

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد	قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا	آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار

نہ اس قطعہ بلکہ غالب نے اپنے اور قصیدوں میں بہادر شاہ ظفر کو مخاطب کر کے

جو کچھ کہا ہے، اس کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کیسے یقین کیا جائے کہ مرزا اپنے مقابلہ میں بہادر شاہ کو اہم نہیں سمجھتے تھے۔

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ	مظہرِ ذوالجلال والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف	نوبہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز	جس کا ہر قول معنیِ الہام
اے ترا لطفِ زندگی افزا	اے ترا عہد فرخی فرجام
ہو سکے کیا مدح؟ ہاں اک نام ہے	دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا
فکر اچھی پر ستائش ناتمام	عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا
فخرِ دیں، عزِ شان و جاہ و جلال	زینتِ طینت و جمالِ کمال
کار فرمائے دین و دولت و تخت	چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت
سایہ اس کا، ہما کا سایہ ہے	خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے
اے مفیضِ وجود و سایہ و نور	جب تلک ہے نمود سایہ و نور
اس خداوند بندہ پرور کو	وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد، دل شاد، شادماں رکھیو

اور غالب پہ مہرباں رکھیو

تجھ کو شرف مرحبا نتاب مبارک	غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

غالب فارسی میں بھی اسی قسم کی قصیدہ خوانی کر کے بہادر شاہ ظفر کو اپنے عجز و نیاز کا خراج پیش کرتے رہے، پھر معلوم نہیں کون سا ایسا موقع آیا جس سے ظاہر ہو کہ وہ اپنے کو بہادر شاہ ظفر سے اہم سمجھتے رہے، ان سے مرید ہوئے، ان کی ملازمت کیلیے

ترٹپے، پھر ان کے مصاحب بننے کے بعد شہر میں اتراتے پھرے، ورنہ بقول ان ہی کے شہر میں ان کی آبرو کیا تھی۔

غالب پر یہ الزام ضرور عائد آتا ہے جس کے مداح، غلام، کارگزار، خانہ زاد اور مرید، ادھار کھانے سے محفوظ نوکر اور بندہ رہے، اس کی مصیبت، زوال، اور موت پر ان کا قلم خاموش رہا، انھوں نے عارف کا جس انداز میں مرثیہ لکھا تھا اسی طرح غزل کے علامتی الفاظ کی آڑ میں بہادر شاہ کا مرثیہ لکھ سکتے تھے، جس سے انگریزوں کی حکومت کے قانون کی گرفت میں بھی نہ آتے، اور ان کا ایک اہم فرض بھی ادا ہوجاتا، لیکن برطانوی حکومت کی قہرمانی سے مرعوب ہو کر یہ جسارت نہ کر سکے، اور سچ تو یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر خواہ کیسے ہی بے جان حکمراں رہے ہوں، لیکن ان کی موت ایک عظیم الشان سلطنت، ایک شاندار تہذیب، ایک پرشکوہ ماضی کی موت تھی، جس طرح سعدی نے زوالِ بغداد پر ایک خونچکاں ماتم کیا تھا، اسی طرح دہلی کی تباہی پر ایک دل فگار اور دل خراش ماتم لکھنے کی ضرورت تھی، غالب ہی یہ فرض اور اپنی نمک خواری کا حق ادا کر سکتے تھے، لیکن وقت کی مصلحتوں کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے، مگر وہ کوئی ماتم لکھنا بھی چاہتے تو شاید لکھ نہیں سکتے تھے، کیونکہ وہ محض ایک غزل گو شاعر تھے، کربلا کے واقعات پر مراثی لکھنے کی کوشش کی تو اس میں وہ ناکام رہے، غزل کے ذریعہ سینہ کوبی کی ساری قوت عارف کی موت پر صرف کر چکے تھے، پھر تمام غزل گویوں پر یہ الزام آتا ہے کہ وہ اپنے ماحول کے سنگین واقعات سے بے خبر ہو کر حسن و عشق ہی کے نغمے الاپتے رہے، ان میں سے بعض شاعر شہر آشوب لکھ کر قانع ہو جاتے، گو ان میں بھی واقعہ نگاری سے زیادہ شعر گوئی ہی کے فن کا مظاہرہ ہوتا۔ امیر کے بارہ میں مشہور ہے کہ

وہ غم جاناں کے ساتھ غم دوراں میں بھی مبتلا رہے۔ انھوں نے تقریباً ۲۴ مثنویاں لکھیں جن میں عشق و عاشقی کی داستان کے بیان کے علاوہ اپنی پالتو سوہنی و موہنی بلی، مرغ، بکری، بٹیر بازی وغیرہ پر بے سود باتیں لکھ کر اپنی شاعرانہ صلاحیتیں ضائع کیں، انھوں نے اپنی آنکھوں سے نادر شاہ کے حملے سے دہلی کو برباد ہوتے ہوئے دیکھا، ہندوستان پر احمد شاہ ابدالی کے پانچ حملے ان ہی کی زندگی میں ہوئے، دلی کئی بار لوٹی گئی، مرہٹوں، روہیلوں اور جاٹوں نے دلی اور آگرہ کو جس طرح تباہ کیا، اس کا ہولناک نقشہ ان کی نظروں کے سامنے رہا، عالمگیر ثانی کا قتل ان کی زندگی میں ہوا، غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم کے سینہ پر چڑھ کر اس کو اندھا کیا، یہ سارے جاں گداز واقعات ان کی زندگی میں ہوئے، لیکن انھوں نے ان کو اپنی مثنویوں کا موضوع نہیں بنایا، اگر بناتے تو یہ قیمتی تاریخی ماخذ بھی ہو جاتے، ذکر میر میں اپنے زمانہ کے جستہ جستہ کچھ واقعات لکھ کر بظاہر کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن انھوں نے اس طرح محض اوس سے اپنی پیاس بجھائی ہے، ذکر میر ہی کی طرح غالب نے بھی دستنبو میں غدر کے واقعات کو گھٹی گھٹی تحریروں میں قلمبند کر کے اور اپنے خطوط میں اپنے زمانہ کی ہولناکیوں کی طرف اشارہ کر کے یہی کفارہ ادا کیا ہے، لیکن ان سے یہ الزام دور نہیں ہوتا کہ وہ اپنے شاہی آقا اور ولی نعمت بہادر شاہ ظفر کو بھول کر انگریزوں کی خوشامد اور چاپلوسی میں لگ گئے، لیکن اس بے غیرتی اور بے حمیتی میں سارا ہندوستان مبتلا ہو گیا تھا، ہندوستانیوں کو بہادر شاہ ظفر کا ماتم کرنے کی جرأت برطانوی دورِ حکومت میں تو نہ ہوئی، ۱۹۴۷ء کے بعد ہی ان کے المناک انجام پر کھلے بند آنسو بہانے کا موقع ملا۔

غالب کی یہ کوتاہی اور تقصیر نظر انداز کر دی جائے تو پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انکی غزلوں

میں تو نہیں لیکن ان کی مثنوی چراغ دیر، پنج آہنگ، دستنبو اور ان کے خطوط میں انکی حب الوطنی کے جذبات کے روشن ستارے جھلملاتے نظر آتے ہیں،

اکرام صاحب اپنی کتاب غالب نامہ کے پہلے اڈیشن میں تو یہ کہہ گئے کہ مرزا میں حب وطن نہ تھا، وہ مشہد کی کبھی نہیں تھے، گرچہ کبھی تھے، وہ ملکی یا نسلی تعلقات کو بہت اہمیت نہیں دیتے تھے۔ لیکن اکرام صاحب کی رائے ان کی کتاب کے چوتھے اڈیشن میں کچھ بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں کہ "وطنیت کی موجودہ صورت جو حقیقتاً مغرب سے ماخوذ ہے، اس قدر نئی ہے کہ مرزا سے اس کی توقع رکھنا عبث ہے..... لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حب وطن سے عاری تھے یا اگر ان کے ہم وطنوں پر کوئی زیادتی ہوتی تو اس کا ان کو دکھ نہ ہوتا، غدر کے بعد اہل دہلی کو میرٹھ کے باغیوں کی جو سزا بھگتنی پڑی تھی، اس کی شکایت سے مرزا کے خطوط بھرے ہوئے ہیں، اور جا بجا ان کے دل کے پھپھولے پھوٹ گئے ہیں، ان خطوط کو پڑھتے ہوئے خیال رکھنا چاہیے کہ انھیں لکھتے وقت مرزا نے اپنا مافی الضمیر پوری طرح ظاہر نہیں کیا، اور تمام حالات ڈر ڈر کے لکھے ہیں۔" (ص ۳۷۹)

یہ صحیح ہے کہ ان کی حب الوطنی میں وطنیت کا وہ معیار نہیں جو آجکل کے سیاست دانوں اور صحافت نگاروں نے قائم کر رکھا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کے زمانہ میں جو حب الوطنی کا معیار تھا وہ ان میں موجود تھا، اس زمانہ کا معیار یہ تھا کہ مولد اور مسکن کے ساتھ ملک کے اور دوسرے شہروں اور وہاں کی تمام چیزوں سے شیفتگی ہو، وہاں کے لوگوں سے اخلاص و محبت ہو، ان کے دکھ درد سے دل تڑپ اٹھتا ہو، یا وہاں کے باشندوں میں جو خوبیاں ہوں ان کی قدر و منزلت دلوں میں ہو، وغیرہ وغیرہ۔ اس معیار پر

غالب کی حب الوطنی پوری اترتی ہے،

غالب کا مولد اکبرآباد یعنی آگرہ تھا، اس کو چھوڑ کر وہ دہلی میں آکر آباد ہوگئے، یہی ان کا وطن ہوگیا تھا، لیکن وہ اپنے مولد کو نہیں بھولے، نواب ضیاء الدین احمد ایک دفعہ آگرہ گئے تو ان کو غالب نے فارسی میں ایک خط لکھا، اس میں آگرہ کو یاد کر کے جس طرح تڑپ اٹھے ہیں، اس سے ان کو اپنے مولد سے جو غیر معمولی محبت رہی، اس کا اظہار پورے طور پر ہوتا ہے، انھوں نے یہ خط اشک و آہ کے ساتھ لکھا، اور اپنے اس وطن میں نیر کو اپنے دیدہ و دل کا پیام شوق بھیجنے میں بہت خوش تھے، نیر کو لکھتے ہیں کہ اکبرآباد کو چھوٹی نظر سے نہ دیکھنا، وہ اس کی آبادی اور ویرانہ کے ساتھ اپنے کھیل کی جگہ کو بھی یاد کرتے ہیں، جہاں وہ مجنون کی طرح رہے، اور اب اسکی یاد میں خونیں آنسو بہاتے رہتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا کہ جب اس سرزمین میں گھاس کے بجائے ان کی محبت اُگتی تھی، اور درخت کے بجائے ان کا دل ہی بار آور ہوتا تھا، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس گلکدہ میں نسیم اس طرح بہتی کہ تند صبوحی پینا اور بادسا نماز میں پڑھنا بھول جاتے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس گلزار کا ہر ذرۂ خاک ان کے لیے ایک دل نشین پیام ہوتا، اور اس گلستاں کی ہر پتی ان کے لیے خاطر نشان دعا بنی رہتی۔

(یہ فارسی خط مولانا غلام رسول مہر کی غالب کے صفحہ ۵ پہ درج ہے۔)

انھوں نے ہندوستان کے بعض شہروں کی جو تعریف دل کھول کر کی ہے اس سے ان کے وطنی جذبات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، ۱۸۲۶ء میں غالب کلکتہ جاتے ہوئے بنارس ٹھہرے، یہ شہر ان کو بہت پسند آیا، اپنے ایک خط مورخہ ۳۱ دسمبر ۱۸۶۱ء میں لکھتے ہیں:

"بھائی! بنارس خوب شہر ہے، اور میرے پسند ہے، ایک مثنوی میں نے اسکی تعریف میں لکھی ہے، اور چراغ دیر اس کا نام رکھا ہے، وہ فارسی دیوان میں موجود ہے۔"

یہ مثنوی طویل ہے، اس میں تقریباً ۱۰۸ اشعار ہیں، شروع میں وہ شکایت کرتے ہیں کہ دلی چھوڑنے کے بعد ان کے دوستوں نے ان کو بھلا دیا، وہ بنارس میں بیٹھ کر اپنے دہلی کے دوستوں میں سے مولانا فضل حق، حسام الدین حیدر اور امین الدین احمد خاں کو یاد کرکے بے چین رہتے ہیں، جو دہلی سے ان کی شیفتگی کا مزید ثبوت ہے، وہ مولانا فضل حق خیرآبادی کی شکل میں پھر ایک بار ناز و افتخار کے جلوے دیکھنا چاہتے تھے، حسام الدین حیدر خاں کو یاد کرکے لکھتے ہیں کہ وہ انکے بازوئے ایمان کے تعویذ ہیں، اور امین الدین احمد خاں کو یاد کرکے کہتے ہیں کہ وہ ان کی قبائے جاں کے پیوند ہیں، ان دوستوں نے ان کو یاد نہیں کیا تو پھر ایک نامراد عاشق کی طرح دہلی پر یہ واسوخت لکھ کر اپنی بھڑاس نکالی کہ دل ان کا دہلی کے بوستاں کے داغ فراق سے نہیں بلکہ دوستوں کی بے مہری کے غم میں جل رہا ہے، لیکن دہلی کی محبت میں اس کو بوستاں ہی کہنے پر مجبور ہوئے، پھر جلی کٹی باتیں بھی لکھتے ہیں، کہ دہلی میں اگر نہ بھی رہے تو غم نہیں، یہ آباد رہے یا اجڑ جائے اس کا بھی افسوس نہیں، لیکن پھر ان کا قلم رک جاتا ہے کہ دہلی کے ایسے دوست پھر نہ ملیں گے، وہ دوستوں کی سرد مہری کی وجہ سے دہلی جیسی پیاری جگہ کو چھوڑنے کے لیے تیار تو ہو گئے، لیکن چھوڑی نہ جا سکی، ۱۸۲۰ء سے ۱۸۶۹ء تک اپنی زندگی کی بہار و خزاں یہیں گذاری، جس سے ان کی محبت اور بھی بڑھتی گئی،

بنارس کی تعریف دل کھول کر کی ہے، یہ تعریف اسی طرح کی ہے جس طرح کہ ایک عاشق اپنے ایک معشوق کو چھوڑ کر کسی دوسرے معشوق کی تعریف میں رطب اللسان ہو جائے، اس سے غالب کے دہلی کے ان دوستوں کا دل جلا ہوگا، جنھوں نے ان سے سفر کے دوران سرد مہری دکھائی تھی، بنارس کی تعریف کرتے ہوئے وہ یہ کہہ گئے ہیں کہ دہلی بنارس کا طواف کرنے کے بعد ہی دوسرے شہروں پر لاف زنی کر سکتی ہے۔

کہ می آید بدعویٰ گاہ لافش
جہان آباد از بہر طوافش

پھر کہتے ہیں کہ نظر جب بنارس سے ناآشنا ہوتی ہے تو اس میں آشنائی کی بہار کی وجہ سے خود گلشن کی ادائیں پیدا ہو جاتی ہیں، بنارس کی شاعرانہ تعریف سے خود شاعری کو بہشت کا سرمایہ حاصل ہو جاتا ہے،

سخن را نازشِ مینو قماشی
زگلبانگ ستایش ہائے کاشی

پھر بنارس کو بہشت، خرم اور فردوس معمور کہتے ہیں:

تعالی اللہ بنارس چشم بد دور
بہشتِ خرم و فردوس معمور

بنارس میں جو گنگا بہتی ہے، اس کے متعلق کہتے ہیں کہ کسی نے کہدیا تھا کہ بنارس چین ہے، یعنی چین جس طرح اپنے نگارخانوں کے لیے مشہور رہے، اسی طرح بنارس ہے، اس کو سن کر بنارس کی پیشانی پر شکن پڑ گئی، جو گنگا کی شکل میں بہتی نظر آتی ہے،

بنارس را کسے گفتا کہ چین است
ہنوز از گنگ چینش بر جبین است

بنارس کو پھر دہلی پر ترجیح یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ اس کی پرکاری کو دیکھ کر دہلی اس پر درود بھیجتی رہتی ہے، یعنی دہلی اس کی تعریف و تحسین کرنے پر مجبور رہے،

بخوش پرکاری طرز وجودش
ز دہلی می رسد ہر دم درودش

کہتے ہیں کہ دہلی میں جو نہر بہتی ہے وہ دراصل بنارس کو خواب میں دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر گیا ہے،

بنارس را مگر دیدست در خواب
کہ می گردد ز نہرش در دہن آب

بنارس کے خس و خار کو گلستاں اور اس کے غبار کو روح کا جوہر بتایا ہے،

خس و خارش گلستانست گوئی
غبارش جوہر جانست گوئی

اس سلسلہ میں غالب کہتے ہیں کہ بنارس کا ہر موسم معتدل رہتا ہے، بہار کا موسم ہو یا گرمی و سردی کا ہو، ہر موسم میں اس کی فضا جنت کی ایسی رہتی ہے، اس کی تائید یا تردید تو وہاں کے لوگ کر سکتے ہیں، بنارس کی اور تعریفیں اس طرح کرتے ہیں کہ اس کے چمن زار کی فضا میں بہاروں نے پھولوں کا زنار باندھ رکھا ہے، اور آسمان کے شفق کی رنگینی دراصل بنارس کا تلک ہے۔

بتسلیم ہوائے آں چمن زار ز موج گل بہاراں بستہ زنار

فلک را قشقہ اش گر بر جبیں نیست پس ایں رنگینی موج شفق چیست

پھر یہاں کے معشوقوں اور پری زادوں کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ ان کی کمر تو نازک ہوتی ہے، لیکن دل مضبوط ہوتا ہے، وہ نادان ہیں لیکن اپنے کام یعنی دل لینے میں دانا ہیں، ان کے لبوں کی مسکراہٹوں میں بڑا فطری پن ہے، ان کے منہ بہار کے پھولوں کے لیے قابل رشک ہیں، وہ اپنی لطافت میں موتیوں کی موج سے زیادہ نرم ہیں اور ناز میں عاشق کے خون سے زیادہ گرم رو ہیں، ان کی چال جال کی صورت کا نقش بناتی ہے، اور پھولوں کی جھاڑی کا جال بچھاتی ہے، وہ نہ صرف غارت گر ہوش ہیں، بلکہ بستر کی بہار اور آغوش کی عید نوروز ہیں، وہ اپنے جلووں سے آگ کو بھی روشن کرتے رہتے ہیں، وہ خود تو بت ہیں، لیکن بت پرستوں اور برہمنوں کے جلانے والے معشوق ہیں، وہ دونوں عالم کا سامان سمیٹے ہوئے گلستاں کا انداز رکھتے ہیں، ان کے چہروں کی چمک دمک ایسی ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے گنگا کے کنارے کسی نے چراغ روشن کر دیے ہیں، جب گنگا میں نہاتے ہیں تو گنگا کی ہر موج کو آبرو بخشتے ہیں، ان کا قد قیامت کا سا ہوتا ہے، ان کی لمبی لمبی پلکیں دلوں کی صفوں پر برچھیاں چلاتی رہتی ہیں، ان کا جسم دل افزا ہے

اور دل کے لیے سراپا مژدۂ آسایش ہے، اپنی مستی میں موجوں سے بھی زیادہ مست ہیں اور لطافت میں پانی سے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں، گنگا کی آغوش بھی ان کے لیے بے تاب رہتی ہے، ان کے جلووں سے سیپ کے اندر کے موتی بھی شرمندہ رہتے ہیں، اب ذرا اصل اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

میانہا نازک و دلہا توانا ز نادانی بکار خویش دانا

تبسم بسکہ در لبہا طبیعی ست دہنہا رشک گلہائے ربیعی ست

بہ لطف از موج گوہر نرم روتر بناز از خون عاشق گرم روتر

ز انگیز قد انداز خرامی بپائے گلبنی گسترده دامی

ز رنگیں جلوہ ہا غارت گر ہوش بہار بستر و نوروز آغوش

ز تاب جلوۂ خویش آتش افروز بتان بت پرست و برہمن سوز

بساماں دو عالم گلستاں رنگ ز تاب رخ چراغان لب گنگ

رسانده آزادی شست و شوئی ہر موجے نوید آبروئی

قیامت قامتاں مژگاں درازاں ز مژگاں بر صف دل نیزہ بازاں

بتن سرمایہ افزایش دل سراپا مژدۂ آسایش دل

بہ مستی موج را فرمودہ آرام ز نغزی آب را بخشیدہ اندام

ز بس عرض تمنا می کند گنگ ز موج آغوش ہا وا می کند گنگ

ز تاب جلوہ ہا بے تاب گشتہ گہرہا در صدف ہا آب گشتہ

اس کے بعد پھر بنارس کی تعریف یہ کہکر کرتے ہیں کہ بنارس ایک معشوق ہے، اور گنگا اس کا آئینہ ہے، جس سے وہ اپنی آرایش صبح و شام کرتا رہتا ہے اور اس

پری چہرہ کا عکس فلک پر سونے کے سورج میں پڑتا رہتا ہے، سبحان اللہ کیا حسن و جمال ہو کہ اس کا حسن ایسے آئینہ میں رقص کرتا رہتا ہے، بنارس ایک لا ابالی حسن کا بہارستان ہے جس کی کوئی مثال نہیں،

مگر گوئی بنارس شاہدی ہست   زگنگش صبح و شام آئینہ در دست

بناز عکس روی آں پری چہر   فلک در زر گرفت آئینہ از مہر

بنام ایزد زہے حسن و جمالش   کہ در آئینہ می رقصد مثالش

بہارستانِ حسن لا ابالی ست   بہ کشور ہا سمر در بے مثالی ست

غالب بنارس سے پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے، جہاں دو سال تک مقیم رہے، وہ اپنی پنشن کی بحالی کی کوشش میں گئے تھے، وہاں ان کی مطلب برآری نہ ہو سکی، لیکن وہاں کی آب و ہوا ان کو راس آ گئی، تو کلکتہ کی آب و ہوا اور دوسری چیزوں کی تعریف دل کھول کر کی، مولانا ابو الکلام آزاد لکھتے ہیں کہ کلکتہ ہندوستان کا سب سے زیادہ نشیبی حصہ ہے، آب و ہوا حد درجہ مرطوب اور بالائی ہند کی تمام صحت افزا خصوصیات سے محروم ․․․․ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کی جس قدر تحریرات ملتی ہیں، کلکتہ کو آب و ہوا کے اعتبار سے بدترین مقام قرار دیتی ہیں ․․․․ با ایں ہمہ یہ عجیب بات ہے کہ مرزا غالب دو سال تک کلکتہ رہے، اور آب و ہوا کی ناموافقت انھیں یک قلم محسوس نہیں ہوئی، اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اس کی لطافت و خوشگواری کی مداحی میں رطب اللسان ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کے بہت سے رجحانات و اعمال کی طرح یہ تاثر بھی ایک خاص جذبہ کا نتیجہ تھا، انگریزوں کے اوضاع و اطوار سے خوش اعتقادی اور ہر اس چیز کی پسندیدگی جو انگریزوں کے نزدیک پسندیدہ ہو۔ (بحوالہ غالب از غلام رسول مہر ص ۱۱۲-۱۱۰)

مولانا ابو الکلام آزاد کی اس رائے سے اتفاق کرنے میں تامل ہوتا ہے کہ غالب نے کلکتہ کو اس لیے پسند کیا کہ وہ انگریزی دار الحکومت اور انگریزوں کا پسندیدہ مرکز تھا، غالب کو یہاں کی آب و ہوا راس آئی تو کیا اس لیے کہ یہ انگریزوں کا پسندیدہ مرکز تھا؟ بنارس تو انگریزوں کا پسندیدہ مرکز نہیں تھا، پٹنہ میں بھی اس وقت تک انگریزوں کا کوئی خاص اثر نہ تھا، غالب انگریزوں کی بعض چیزیں عزیز رکھتے رہے، لیکن شہروں کی پسندیدگی انگریزوں کی خاطر نہیں ہو سکتی تھی، اس میں زیادہ تر وہ جذبہ کام کر رہا تھا کہ یہ ان کے ملک کا ایک ترقی یافتہ شہر تھا، دہلی، بنارس، پٹنہ اور کلکتہ کی تعریف ایک ساتھ اس طرح کرتے ہیں:

گفتم اکنوں بگو کہ دہلی چیست   گفت جان است و ایں جہانش تن

گفتمش چیست ایں بنارس گفت   شاہدے مست محو گل چیدن

گفتمش چوں بود عظیم آباد   گفت رنگیں تر از فضائے چمن

گفتمش سلسبیل خوش باشد   گفت خوشتر نہ باشد از سومن (دریائے سون)

حال کلکتہ باز جستم گفت   ہشتمش گفتن ابد انتسلیم

گفتم آدم بہم رسد ورنے   گفت از ہر دیار و از ہر فن

اگر غالب انگریزوں کے کسی قصیدہ میں کلکتہ کی تعریف کرتے تو خیال ہو سکتا تھا کہ انگریزوں کی خوشنودی کی خاطر یہ مدح سرائی ہو رہی ہے، لیکن وہ اپنے نجی خطوط میں اس کی تعریف کرتے رہے، اپنے ایک فارسی خط میں علی بخش خاں رنجور کو لکھتے ہیں "کہ کلکتہ کیا ہے کہ یہاں دنیا بھر کا مال مل سکتا ہے، یہاں موت کا علاج تو نہیں دستیاب ہو سکتا ہے، اور نہ قسمت حاصل ہو سکتی ہے، لیکن ان کے علاوہ ہر چیز ارزاں ہے"

پھر کلکتہ سے واپسی کے بعد مولوی سراج الدین احمد کو ایک فارسی مکتوب میں اس شہر کی تازگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کو اہل و عیال کا خیال نہ ہوتا تو اسی مینوکدہ میں وہ آباد ہو جاتے، اپنی پسندیدگی کی خاص وجہ یہ لکھی ہے کہ ان کو یہاں ٹھنڈی ہوائیں ملتی تھیں، پانی بھی انکے مزاج کے مطابق تھا، پھر بقول ان ہی کے ان کو یہاں خالص شراب بھی ملتی رہی اور میٹھے میٹھے پھل بھی جن میں کھجوریں بھی تھیں، اور پھر کلکتہ پر متغزلانہ رنگ میں اشعار بھی کہہ دیے جن سے اس شہر سے انکے دلی لگاؤ کا پورا اندازہ ہوگا۔

کلکتہ کا کیا جو ذکر تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ انکی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے تازہ شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

یہ واضح رہے کہ کلکتہ ہی میں غالب سے وہ ادبی مجادلہ ہوا، جس سے انکا راہ چلنا دشوار ہو گیا تھا، انھوں نے کلکتہ کے لوگوں کی بدسلوکیوں سے گھبرا کر اپنی مثنوی باد مخالف لکھی جس میں اپنی غریب الوطنی کا ذکر اہل کلکتہ کی نامہربانیوں کی شکایت کی ہے، اس میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ جانتے تو اس جھگڑے کو بڑھا سکتے تھے، لیکن ان کو خیال ہوا کہ اس طرح ان کے وطن کی عزت و آبرو پر حرف آئیگا اور دہلی کا خون ان کی گردن پر آئے گا۔ وہ ننگ دہلی بننا نہیں چاہتے تھے،

برگ دنیا نہ ساز دنیش بود
ننگِ دہلی و سرزمینش بود

آہ ز ان دم کہ بعد رفتنِ من
خونِ دہلی بود بہ گردنِ من

ان اشعار سے بھی ان کو دہلی کی محبت اور وطن دوستی کا پورا اظہار ہوتا ہے،

ادبی مجادلہ کی تلخیوں کو یاد کر کے وہ کلکتہ کی ہجو لکھ سکتے تھے، لیکن اس شہر کی محبت ان پر غالب آئی اور اسکی ہجو لکھنے کے بجائے اپنے خطوط اور اشعار میں اس کی تعریف کرتے رہے۔

(باقی)

آٹھویں صدی ہجری میں اسلامی علوم وفنون کا ارتقاء

از حافظ محمد نعیم ندوی صدیقی رفیق دارالمصنفین

(۴)

مجددیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے تحفظ اور اس کی تجدید و اصلاح کے لیے ہر صدی میں اپنے کسی منتخب بندہ کو مامور فرمایا ہے، جو اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کو بیرونی آمیزش سے پاک کر کے اس کی اصل صورت میں پیش کرتا ہے، اس کا سلسلہ ہر زمانہ میں قائم رہا، پہلی صدی ہجری میں اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبد العزیزؓ سے اس سلسلہ کا آغاز ہوا، اور آٹھویں صدی میں جن علماء نے تجدیدی خدمات انجام دیں ان میں حافظ سراج الدین البلقینی کا نام بھی لائق ذکر ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی جنھیں خود بھی نویں صدی ہجری کے مجدد ہونے کا دعویٰ ہے، فرماتے ہیں کہ "حافظ بلقینی آٹھویں صدی کے مجدد تھے، ان میں اس کے تمام شرائط موجود تھے"[1] یہاں یہ بات بھی لائق ذکر ہے کہ پہلی صدی سے نویں صدی تک کے تمام مجددین وطناً مصری اور مسلکاً شافعی رہے ہیں، حافظ سخاوی اور ابن عماد حنبلی نے بھی بلقینی کو آٹھویں صدی ہجری کا مجدد قرار دیا ہے،[2]

---

[1] حسن المحاضرہ للسیوطی ج ۱ ص ۲۳۵ [2] الضوء اللامع ج ۹ ص ۸۰ وشذرات الذہب ج ۷ ص ۵۱

اجتہاد حافظ بلقینی شافعی مذہب سے متاثر تھے، اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصر اس عہد میں شوافع کا مرکز شمار ہوتا تھا، چنانچہ بلقینی کو جن شیوخ سے کسب فیض کا موقع ملا ان کی اکثریت شافعی المسلک تھی، اس لیے ان کا رجحان قدرۃً شافعی مسلک کی طرف ہوا، لیکن وہ ان کے جامد مقلد نہیں تھے، عمر و علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان میں اجتہادی شان پیدا ہوگئی، اور علماء و ائمہ نے انھیں مجتہد مطلق قرار دیدیا، حافظ ابن فہد نے لکھا ہے کہ وہ آخر میں مجتہد ہوگئے اور بہت سے مسائل میں منفرد تھے[1]

ابن حجر کا خیال ہے کہ ان میں اجتہاد کے تمام شرائط بدرجۂ اتم موجود تھے، وکانت آلۃ الاجتہاد فیہ کاملۃ"[2] ابن عماد رقمطراز ہیں

فاق الاقران واجتمعت فیہ	وہ معاصرین پر گوئے سبقت لے گئے
شروط الاجتہاد[3]	اور ان میں اجتہاد کے تمام شرائط مجتمع تھے

علامہ جلال الدین سیوطی اعتراف کرتے ہیں

بلغ رتبۃ الاجتہاد ولہ ترجیحات	وہ اجتہاد کے رتبہ پر پہنچ گئے تھے، بعض
خارجۃ عن المذہب[4]	امور میں ان کے تفردات مذہب سے
	جداگانہ تھے۔

شعر و سخن دینی علوم کے ساتھ شعر و ادب کا بھی ذوق رکھتے تھے، لیکن اس میں کوئی خاص ملکہ حاصل نہ تھا، کبھی کبھی واردات قلبیہ شعر کی شکل اختیار کرلیتی تھیں، مگر ان میں فنی سقم رہ جاتا تھا، اس لیے حافظ بلقینی اپنی طرف شعر کے انتساب کو عار تصور کرتے تھے،[5]

---

[1] لحظ الالحاظ ص ۲۱۴ [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۲ [3] شذرات الذہب ج ۷، ص ۵۱

[4] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۳۵ [5] لحظ الالحاظ بذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۱۶

مکارم اخلاق ان کے صحیفۂ کمال میں مکارم اخلاق کا باب نہایت نمایاں حیثیت رکھتا ہے، علامہ سخاوی لکھتے ہیں:

کان عظیم المروءۃ جمیل	بہت بامروت اور بڑے محبت کرنے
المودۃ مہیبا مع کثرۃ المباسطۃ	والے تھے، اور اپنے احباب سے محبت
لاصحابہ والشفقۃ علیہم	شفقت اور لطف و کرم کے باوجود
والتنویۃ بذکرہم[1]	بڑے باوقار تھے۔

شادی وہ شیخ بہاء ابن عقیل کے خصوصی تلامذہ میں تھے، شیخ مذکور ان سے اتنا زیادہ تعلق خاطر رکھتے تھے کہ ان کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی بھی کردی تھی،

اولاد طبقات کی کتابوں میں ان کے تین صاحبزادوں کا نام ملتا ہے، یہ تینوں علم و فضل میں اپنے والد کے خلف الصدق تھے، سب سے بڑے لڑکے بدر الدین محمد تھے، جو ۷۹۱ھ میں شام کے قاضی مقرر ہوئے، حافظ بلقینی کو اپنی زندگی ہی میں ان کی موت کا داغ اٹھانا پڑا۔

دوسرے شیخ الاسلام جلال عبد الرحمن رمضان ۷۶۳ھ میں پیدا ہوئے، حدیث میں خصوصی مہارت رکھتے تھے، انھوں نے تفسیر و فقہ میں متعدد کتابیں بھی تصنیف کیں، مصر میں کئی بار منصب قضا و افتا کی خدمت انجام دی، ابن فہد کا بیان ہے کہ حافظ بلقینی کی وفات کے بعد افتا کی سیادت ان پر ختم تھی[2] حافظ شمس الدین بن ناصر الدین کہتے ہیں کہ "وہ اعیان امت میں سے تھے اور اجتہاد، حفظ اور علوم اسناد میں اپنے والد کے صحیح جانشین تھے، میں نے انکو مجلس درس میں شیخ بلقینی سے مباحثہ کرتے بارہا دیکھا ہے[3] ۸۲۴ھ میں بمقام قاہرہ وفات پائی،

---

[1] الضوء اللامع ج ۶، ص ۸۸ [2] لحظ الالحاظ ص ۲۸۲ [3] ایضاً

تیسرے شیخ علم الدین صالح تھے، جو اپنے زمانہ میں مذہب شافعی کے بہت بڑے علمبردار شمار ہوتے تھے۔ ۷۹۱ھ میں پیدا ہوئے، پہلے اپنے والد اور بھائی سے فقہ کی تحصیل کی، اس کے بعد دیگر شیوخ کے خرمن علم سے بھی استفادہ کیا، ۸۲۶ھ میں قاضی مقرر ہوئے، فقہ میں منفرد مقام حاصل تھا، ۵ رجب ۸۶۸ھ کو فوت ہوئے۔[۱]

وفات ۱۰ ذی القعدہ بروز جمعہ ۸۰۵ھ کو عصر سے کچھ قبل علم وعمل اور فضل وکمال کا یہ نیر تاباں سرزمین قاہرہ میں غروب ہوگیا،[۲] دوسرے دن صبح کو ان کے صاحبزادہ جلال الدین عبد الرحمٰن نے جامع حاکم میں نماز جنازہ پڑھائی، شیخ بلقینی نے محلہ بہاء الدین قاہرہ میں اپنے مکان کے قریب اپنے قائم کردہ مدرسہ میں مدفون ہوئے۔[۳]

ان کی وفات کا عام غم منایا گیا، شعرا نے بکثرت مرثیے لکھے، ان میں شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی کا مرثیہ بہت مشہور ہے، یہ مرثیہ ایک سو بائیس اشعار پر مشتمل ہے علامہ جلال الدین سیوطی نے حسن المحاضرہ میں اس کو نقل کر دیا ہے،[۴] اس کا پہلا شعر یہ ہے:

یا عین جودی لفقد البحر بالمطر واذری الدموع ولا تبقی ولا تذری

تصنیفات دینی علوم میں تبحر کے باوجود کوتاہ قلم تھے، اور بہت کم کتابیں تکمیل تک پہنچا سکے، اس کی وجہ علامہ سخاوی یہ بیان کرتے ہیں کہ بلقینی ہر تصنیف کا آغاز بڑے جوش اور ولولہ اور انہماک کے ساتھ کرتے، لیکن وسعتِ علم کی بنا پر مضامین کا احاطہ کرنے میں ناکام رہتے، اور تصنیف شرمندۂ تکمیل ہی رہتی، انھوں نے بخاری کی شرح لکھنا شروع کی تو صرف بیس حدیثوں کی شرح ۲ جلدوں میں لکھ ڈالی۔[۵] ان کی تصانیف کی تعداد زیادہ ہے، ان میں چودہ ممتاز کتابوں کے نام حافظ ابن فہد نے لحظ الالحاظ میں درج کیے ہیں،

۱ حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۰۹ ۲ الضوء اللامع ج ۶ ص ۹۰ ۳ شذرات الذہب ج ۷ ص ۵۲

۴ حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۳۵ ۵ الضوء اللامع ج ۶ ص ۸۸

جن میں سے کچھ یہ ہیں: حواشی الروضۃ (۲ جلد) شرح الترمذی، حواشی علی الکشاف، التدریب فی الفقہ الشافعیہ، تصحیح المنہاج (۶ جلد) الملمات برد المہمات، محاسن الاصطلاح، الاجوبۃ المرضیۃ عن المسائل المالکیۃ۔[۱]

زین الدین العراقی

نام ونسب عبد الرحیم نام، ابو الفضل کنیت اور زین الدین لقب تھا۔ پورا نسب نامہ یہ ہے: عبد الرحیم بن الحسین بن عبد الرحمٰن بن ابراہیم بن ابی بکر بن ابراہیم۔[۲] اصلاً عراقی اور وطناً مصری مشہور ہوئے۔

خاندان، وطن اور ولادت امام عراقی کردی الاصل تھے، ان کے آباء واجداد اربل کے ایک قصبہ رازنان کے رہنے والے تھے، اربل عراق کا ایک مردم خیز اور حسین وجمیل شہر ہے، امام عراقی کے والد شیخ حسین اپنی صغرسنی ہی میں بعض اعزہ کے ہمراہ وہاں سے نقل مکان کرکے دریائے نیل کے کنارے واقع ایک مقام منشیۃ المہرانی چلے آئے، اور وہاں کی مشہور خانقاہ رسلان کے شیخ تقی الدین القنائی کے دامن سے وابستہ ہوگئے، اور ان کے خصوصی خدمتگاروں کے زمرہ میں شمار ہونے لگے، وہیں ایک عابدہ صالحہ خاتون سے ان کا عقد ہوا، اور کچھ عرصہ کے بعد جب ان کی اہلیہ حاملہ ہوئیں تو شیخ تقی الدین نے پیشین گوئی کی کہ عبد الرحیم نام کا بچہ پیدا ہوگا، چنانچہ ۲۰ جمادی الاولیٰ ۷۲۵ھ کو امام زین الدین العراقی عدم سے وجود میں آئے۔[۳]

نشوونما ان کے والد انھیں اپنے پیر ومرشد کی خدمت میں برابر لاتے تھے، شیخ ان پر اپنا دست برکت پھیر کر درازی عمر وسعادت مندی کی دعا فرماتے، ابھی امام عراقی تین ہی

۱ لحظ الالحاظ ص ۲۲۶ ۲ شذرات الذہب ج ۷ ص ۵۵ ۳ حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۵۱ ۴ الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۱

سال کے تھے کہ والد داغ مفارقت دے گئے، ان کی وفات کے بعد شیخ تقی القنائی نے انکی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا، امام عراقی کو ذہانت وذکاوت اور قوتِ حفظ سے وافر حصہ ملا تھا، اس لیے آٹھ سال کی عمر میں نہ صرف کلام پاک کے حفظ سے فارغ ہو گئے بلکہ کتاب الحاوی، التنبیہ اور الالمام لابن دقیق العید کو بھی دماغ میں محفوظ کر لیا۔[1] علامہ شوکانی نے لکھا ہے کہ وہ ایک دن میں "الالمام" کی چار سو سطریں زبانی یاد کر لیتے تھے۔[2]

طلب علم میں غیر معمولی ذوق کے باعث تمام ممتاز مقامی فضلا، کی بارگاہ میں حاضر ہو کر مستفید ہوئے، سب سے پہلے شیخ ناصر بن محمد بن سمعون، شیخ برہان الدین ابراہیم ابن لاجین الرشیدی، احمد بن یوسف السمین عمر بن محمد الدمنهوری سے عربیت اور قرأت کے فن کی تحصیل کی، جو اس زمانہ میں ان فنون کے صدر نشین شمار ہوتے تھے،

طلب حدیث امام عراقی کو ابتدا میں علم قرأت سے غیر معمولی شغف تھا، اور انھوں نے اپنی پوری توجہ اس کی طرف منعطف کر دی تھی، اس لیے عز الدین بن جماعہ نے ان کو سمجھایا کہ

ان علم القرأة کثیر التعب — علم قرأت بڑا مشکل علم ہے، اور تم ذہین

وانت متوقد الذهن فینبغی — ہو، اس لیے تمھیں اپنی صلاحیتوں

صرف الهمة الی غیره — کو دوسرے علم میں لگانا چاہیے۔

اس سے علم حدیث کی طرف اشارہ تھا، اس لیے سنہ ۷۴۲ھ سے وہ حدیث کی تحصیل میں منہمک ہو گئے، اور سب سے پہلے شیخ شہاب الدین احمد بن البابا سے حدیث پڑھی، اس کے بعد شیخ علاء الدین الترکمانی اور علی بن شاہد الجیش سے صحیح بخاری کی سماعت اور

[1] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۲۱، [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۲۳۶

اس میں مہارت فنی پیدا کی، ابن عبد الہادی سے صحیح مسلم کا سماع کیا،

تحصیل علم کے لیے سفر مقامی علماء اور اہل کمال سے استفادہ کے بعد دوسرے ممتاز و نمایاں علمی مرکزوں سے استفادہ کرنے کے لیے وطن سے باہر قدم نکالا، حافظ تقی الدین ابن فہد کا بیان ہے کہ ۷۵۴ھ میں وہ پہلی بار تحصیل علم کے سلسلہ میں شام گئے، اس کے بعد کوئی سال ایسا نہیں گذرتا تھا، جس میں وہ طلب علم یا حج کے لیے سفر نہ کرتے ہوں، چنانچہ ۷۵۵ھ میں مکہ، ۷۵۶ھ میں اسکندریہ اور ۷۵۸ھ میں دمشق گئے، اس کے بعد علمی اسفار کا ایک مستقل سلسلہ شروع ہو گیا، جن ممالک کا انھوں نے سفر کیا اُن میں طرابلس، بعلبک، نابلس، بیت المقدس، خلیل، غزہ، مکہ، مدینہ، حلب، قاہرہ، حمص، حماۃ، اور صفد کا ذکر ملتا ہے،[1] ان کے علاوہ جہاں کہیں بھی انھیں کسی علمی سرچشمہ کا علم ہوا اس سے مستفید ہوئے، اس ذوق و شوق کا یہ ثمرہ تھا کہ اپنے شیوخ کی موجودگی ہی میں حدیث، فقہ اور دیگر اسلامی علوم میں مرجع خلائق بن گئے تھے۔

حدیث قرأت کی تحصیل کے بعد پہلے انھوں نے مقامی علماء سے حدیث کی تحصیل کی، اسکے بعد دمشق میں شیخ احمد بن عبد الرحمٰن المرداوی، محمد بن اسمٰعیل الحموی، ابن الخباز اور محمد بن اسمٰعیل سے، شام میں امام تقی الدین السبکی سے، مکہ میں احمد بن قاسم الحراری سے، مدینہ میں عفیف المطری سے، حلب میں سلیمان بن ابراہیم سے، مختلف کتب حدیث کا سماع اور اس فن کے نکات حاصل کیے، علامہ سخاوی نے لکھا ہے کہ انھیں علم حدیث پر اتنا عبور حاصل تھا کہ

[1] الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۳

كان شيوخ عصره يبالغون في الثناء عليه بالمعرفة كالسبكي والعلائي وابن جماعة وابن كثير وغيرهم[1]

ان کے ہم عصر شیوخ جیسے سبکی، علائی اور ابن جماعۃ وغیرہ ان کے علم و معرفت کی بے حد تعریف کرتے تھے۔

امام اسنائی انھیں حافظ کہا کرتے تھے[2]، حدیث سے ان کے شغف کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ دمشق میں شیخ محمد اسماعیل سے صحیح مسلم کو صرف ۶ نشستوں میں ختم کیا[3]، مقریزی کا بیان ہے کہ

هو شيخ الحديث انتهت اليه رياسته[4]

وہ شیخ الحدیث ہیں اور ان پر اس فن کی امامت ختم ہے۔

حافظ ابن فہد مکی رقمطراز ہیں:

انهمك في هذا الفن وصرف اوقاته اليه حتى غلب عليه وصار مشهوراً به فتقدم فيه وانتهت اليه رياسته في البلاد الاسلامية مع المعرفة والاتقان والحفظ بلاريب ولامرية بحيث انه لم يكن له فيه نظير في عصره وشهد له

وہ اپنے تمام اوقات صرف کرکے اس فن (حدیث) کی تحصیل میں منہمک ہوگئے، یہانتک کہ یہ فن ان پر چھا گیا اور اسی کی وجہ سے وہ مشہور ہوئے، اور اس میں بہت آگے بڑھ گئے، اسلامی ممالک میں وہ حدیث میں اپنی معرفت، اتقان اور حفظ کے باعث بلاشبہ صدرنشین تھے، اور

۱۷۸

۱ الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۳ ۲ ایضاً ۳ ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۲۳ ۴ الضوء اللامع ج ۴

بالتفرد فيه عدة من حفاظ عصره[1]

ان کے ہم عصر علماء میں اس کی نظیر نہیں ملتی، ان کے متعدد معاصر حفاظ حدیث نے ان کے یکتائے فن ہونے کی شہادت دی ہے۔

امام عزبن جماعۃ جن سے شیخ عراقی کو شرف تلمذ حاصل ہے، فرماتے ہیں کہ مصر کا ہر محدث ان ہی کے فیض کا ممنون ہے[2]۔

فقہ | فقہ اور اصول فقہ میں بھی ان کو کمال حاصل تھا، اس میں انھوں نے محمد بن عدلان، محمد بن اسحاق البلبیسی، جمال الدین الاسنوی اور شمس بن اللبان کے خرمن کمال سے خوشہ چینی کی تھی اور اس میں اتنی مہارت پیدا کرلی کہ اسنوی جیسے جلیل القدر فقیہ بھی ان کی فہم و دانش کے معترف تھے اور عراقی کے فقہی مباحث کو بڑی توجہ کے ساتھ سنا کرتے تھے، حافظ سخاوی نے لکھا ہے کہ اسنوی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ

ان ذهن العراقي مستقيم لايقبل الخطاء[3]

عراقی کا ذہن اتنا صاف اور سلجھا ہوا ہے کہ اس سے کبھی غلطی نہیں ہوتی۔

شیوخ و اساتذہ | امام عراقی نے مختلف ملکوں کے علماء سے استفادہ کیا تھا، اس لیے ان کے اساتذہ کا دائرہ نہایت وسیع ہے، تقی الفاسی جو عراقی کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہیں لکھتے ہیں:-

مسموعاته وشيوخه في غاية الكثرة

ان کے شیوخ و اساتذہ کی تعداد بے انتہا ہے۔

کچھ شیوخ کے نام اوپر آچکے ہیں، ان کے علاوہ جن ممتاز علماء کے اسمائے گرامی

۱ لحظ الالحاظ ص ۲۲۷ ۲ طبقات الاسدی ورق ۹۱ ۳ حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۵۱، ۴ الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۶

کا ذکر ملتا ہے، وہ یہ ہیں :-

محمد بن علی القطروانی، ابن الاکرم، محمد بن عبد اللہ النعمانی، علی بن احمد بن عبد المحسن، محمد بن ابی القاسم الفارقی، مظفر العطار، احمد بن محمد الرصدی، قاضی فخر الدین بن مسکین، ابو الحرم القلانسی، ابو الحسن المرضی، محمد بن احمد الدلاصی، محمد بن موسیٰ الشقراوی، ابن قیم الضیائیہ، ابو بکر بن عبد العزیز، محمد بن محمد الحرانی، یحییٰ بن عبد اللہ الفارقی، شیخ الاسلام تقی السبکی، امام جمال الدین، ابراہیم بن الشہاب، قاضی عبد الرحیم بن ابراہیم البارزی، عبد اللہ ابن داؤد واسطی، عمر بن احمد النفتی، عثمان الاعزازی، محمد بن ابی بکر الخابوری، عبد القادر ابن علی، عمر بن حمزہ، ابراہیم بن عبد اللہ الزبیادی، محمد بن عثمان، طاہر بن احمد، قاسم بن سلیمان الاذرعی، حافظ صلاح الدین العلائی، خلیل بن عیسیٰ المقری، امام خلیل المالکی، فقیہ احمد بن قاسم الحرازی[۱]،

درس وافادہ | امام عراقی کا چشمۂ فیض نہایت وسیع تھا، انھوں نے مختلف مقامات پر درس وتدریس کی مجلسیں آراستہ کیں، دار الحدیث الکاملیہ، مدرسہ ظاہریہ، قراسنقوریہ اور جامع ابن طولون میں مدت دراز تک حدیث کا اور مدرسہ فاضلیہ میں فقہ کا درس دیا، علاوہ ازیں حرمین میں بھی کافی عرصہ درس وتدریس کی خدمت انجام دی[۲]۔

محققین نے لکھا ہے کہ امام عراقی کے شب وروز کا کوئی لمحہ ضائع نہ ہوتا تھا، وطن کے قیام کے زمانہ میں یا تصنیف وتالیف میں مصروف رہتے یا درس وافادہ میں، ابن فہد مکی رقمطراز ہیں :-

في مدة اقامته في وطنه لوكين	وطن کے قیام کے زمانہ میں سماع حدیث،

۱؎ ذیل طبقات الحفاظ ص ۲۲۲ تا ۲۲۵ ۲؎ البدر الطالع ج ۱ ص ۳۵۴

بھم سوی السماع والتصنيف	تصنیف اور افادہ کے علاوہ ان کا
والافادة فتوغل في ذلك حتى	کوئی اور مشغلہ نہ رہتا، اس میں انھیں
ان غالب اوقاته اوجميعها	اتنا انہماک تھا کہ ان کے اوقات
لا يصرفها في غير الاشتغال	کا بڑا حصہ اسی میں گذرتا تھا، اس کے
في العلوم[۱]	علاوہ اور کسی مشغلہ میں نہیں۔

ان کے علمی کمالات کا شہرہ سن کر ایک مخلوق استفادہ کے لیے ٹوٹ پڑی، جن میں مختلف طبقوں اور مختلف ملکوں کے تشنگانِ علم شامل تھے، حافظ شمس الدین دمشقی رقمطراز ہیں :-

رحل اليه للاخذ عنه و	ان سے تحصیل علم اور سماع کے لیے
السماع الجم الغفير الكبير منهم	چھوٹے بڑے طالبانِ علم کا ایک جم غفیر
والصغير فلازموه وانتفعوا	ٹوٹ پڑا، انھوں نے عراقی کی صحبت
به وكتب عنه جميع الائمة	میں رہ کر ان سے استفادہ کیا، ان کے
من العلماء الاعلام والحفاظ	علاوہ بڑے بڑے ائمہ، علماء، اور
ذوالفضل[۲]	جلیل المرتبت حفاظ نے انکی مرویات کی کتابت کی۔

کہا جاتا ہے کہ ان کے ہم عصر علماء کی اکثریت ان ہی کے خرمن فیض سے مستفید ہوئی، خاص طور سے محدثین مصر کے بارے میں امام ابن جماعہ اور تقی الفاسی کا بیان ہے کہ وہ سب امام عراقی کے صحبت یافتہ تھے، ان کے شیوخ کی طرح ان کے تلامذہ کا یکجا ذکر کہیں نہیں ملتا، متفرق طور پر تقی الفاسی، حافظ جمال الدین بن ظہیرہ، صلاح الدین

۱؎ لحظ الالحاظ ص ۲۲۶ ۲؎ ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۳۴

الاقفہسی، نورالدین الہیثمی، حافظ عماد الدین ابن کثیر اور حافظ ابن حجر عسقلانی کے نام ملتے ہیں،
ان میں ابن حجر خاص طور پر امام عراقی کی صحبت سے زیادہ مستفید ہوئے تھے، وہ خود
ابناء الغمر میں لکھتے ہیں:

قرأت علیہ کثیرا من المسانید	میں نے ان سے بکثرت مسانید اور
والاجزاء وغیر ذلک	اجزاء حدیث وغیرہ کو پڑھا۔

امام عراقی حافظ ابن حجر کی ذہانت اور قوت حافظہ کے بہت معترف تھے اور اپنے
تمام تلامذہ میں انھیں بہت محبوب رکھتے تھے، وفات کے وقت جب ان سے پوچھا گیا کہ
آپ کے بعد حفاظ حدیث میں کون باقی رہا تو شیخ عراقی نے سب سے پہلا نام علامہ ابن حجر
ہی کا لیا، اس کے بعد اپنے صاحبزادے ابوزرعہ کا اور پھر نورالدین الہیثمی کا[1]، اور یہ
حقیقت ہے کہ امام عراقی نے اگر علم و فن کے میدان میں کوئی اور کارنامہ نہ بھی انجام
دیا ہوتا تو بھی ان کے فخر کے لیے ابن حجر جیسا جلیل القدر امام کافی تھا،

تبحر و جلالت علم

امام عراقی کو حدیث کے علاوہ قرأت، اصول فقہ، نحو، لغت اور عربیت
وغیرہ مختلف علوم میں پورا کمال حاصل تھا، لیکن حدیث نبوی میں علم و معرفت کی شہرت
کے مقابلہ میں دوسرے علوم دب گئے اور ان کی مقبولیت و شہرت محدث ہی کی حیثیت
زیادہ ہے، ابن الجزری طبقات القراء میں انھیں "حافظ الدیار المصریۃ و
محدثہا وشیخہا" لکھتے ہیں، مقریزی رقمطراز ہیں:

شیخ الحدیث انتہت الیہ	وہ شیخ الحدیث ہیں اس فن کی ریاست
ریاستہ	ان پر ختم ہے۔

[1] شذرات الذہب ج ۷، ص ۵۶

ان کے تلمیذ رشید صلاح الاقفہسی کا بیان ہے کہ "میرے استاذ امام عراقی حدیث
کے متن اور سند دونوں میں بڑے ماہر تھے"[1] علامہ تقی الدین ابن رافع کو جب قاضی
عزالدین بن جماعہ کے انتقال کی خبر ملی تو انھوں نے فرمایا کہ

ما بقی الآن بالقاہرۃ محدث	اب قاہرہ میں سوائے امام عراقی
الا الشیخ زین الدین العراقی[2]	کے کوئی محدث باقی نہیں رہا،

حافظ ابن حجر نے جو منتخب زمانہ محدثین کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے، ابناء الغمر
فی ابناء اہل العصر میں شیخ امام عراقی کے فضل و کمال کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے
ایک جگہ لکھا ہے:

لم نر فی ہذا الفن اتقن منہ	میں نے اس فن میں ان سے زیادہ صاحب
..... ولم ار اعلم لصناعۃ	اتقان نہیں دیکھا..... اور فن حدیث
الحدیث منہ وبہ تخرجت	کا ان سے بڑا عالم میری نظر سے گذرا
	اور میں نے بھی انہی سے استفادہ کیا۔

حافظ ابوالمحاسن الدمشقی نے ان الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے:

الامام الاوحد العلامۃ	وہ علامہ، امام، حافظ اسلام یگانۂ عہد
.... حافظ الاسلام فرید	اور منتخب روزگار تھے، اپنے زمانہ
دھرہ و وحید عصرہ من فاق	میں حفظ و اتقان میں سب پر فائق
بالحفظ والاتقان فی زمانہ[3]	تھے، اور ان کے معاصر ائمہ نے بھی حدیث
وشہد لہ ائمۃ عصرہ بالتفرد فی فنہ[4]	میں ان کی انفرادیت کی شہادت دی ہے،

[1] الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۶ [2] لحظ الالحاظ ص ۲۲۷ [3] بحوالہ الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۵ [4] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۲۰

ذکاوت وذہانت نہایت ذہین وذکی تھے، بڑا قوی حافظہ پایا تھا، ارباب طبقات نے لکھا ہے کہ وہ الامام ابن دقیق العید کی چار سو سطریں روزانہ زبانی یاد کرلیتے تھے، کتاب الحاوی کا بیشتر حصہ انھوں نے بارہ دن میں حفظ کرلیا تھا، بعض علما کا خیال ہے کہ انھوں نے صرف پندرہ دن میں یہ پوری کتاب حافظہ کے خزانہ میں محفوظ کرلی تھی[1]، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ:۔

کان یملیھا من حفظہ متقنۃ	وہ اپنے حافظہ سے بکثرت نئے نکات
مھذبۃ محررۃ کثیرالفوائد	وفوائد بڑی خوبی اور ترتیب کے ساتھ
الحدیثیۃ[2]	املا کراتے تھے،

عہدۂ قضاء اپنی دیانت، عدالت اور تقوی کی بنا پر ۱۲ر جمادی الاولی ۷۸۸ھ کو مدینہ منورہ کے منصب قضا پر مامور ہوئے، اس عہدہ کے ساتھ مسجد نبوی کی امامت وخطابت کا شرف بھی حاصل ہوا، کچھ عرصہ کے بعد اسی منصب پر مکہ مکرمہ منتقل کردیے گئے، اور تین سال پانچ ماہ تک حسن وخوبی کے ساتھ اس کے فرائض انجام دیے، ۱۳ر شوال ۷۹۱ھ کو اس سے سبکدوشی حاصل کرلی، اور شیخ شہاب الدین دمشقی ان کے جانشین مقرر ہوئے[3]۔

ذوق شعروسخن حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ امام عراقی کو شعروادب کا بھی بہت پاکیزہ ذوق تھا، ان کے قصائد ونظمیں اس کا ثبوت ہیں، ایک قصیدہ کا اول اور آخری شعر درج کیا جاتا ہے، اس سے ان کے ذوق شعری اور طرز کلام کا اندازہ ہوگا۔ یہ دعائیہ نظم انھوں نے اس وقت کہی تھی جب دریائے نیل کے خشک ہوجانے کی وجہ سے مصر میں قحط پڑگیا تھا، فرماتے ہیں۔

[1] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۲۷، [2] الضوء اللامع ج ۴ ص ۱۷۵، [3] ذیل طبقات الحفاظ ص ۲۳۴

اقول لمن یشکو توقف نیلنا	سل اللہ یا او بفضل تائید
وانت نغفار الذنوب ساترا	العیوب وکشاف الکروب اذا نودی

(یعنی جو شخص نیل کے خشک ہوجانے کا شکوہ کرتا ہے میں اس سے کہتا ہوں کہ وہ خدا کے فضل ونصرت کا طالب ہو، اے خدا تو گناہوں کی مغفرت کرنے والا، عیبوں کو چھپانے والا ہے، اور جب دعا کیجاتی ہے تو مصیبتوں کو دور کرنے والا تو ہی ہے)

شاعری میں ان کی قادر الکلامی کے اور بھی شواہد ہیں، انھوں نے امام بغوی کی مشہور کتاب "المنہاج" کو ایک ہزار تین سو سڑسٹھ اشعار میں نظم کیا، اور اس کا نام النجم الوہاج رکھا، اسی طرح الاقتراح لابن دقیق العید کو چار سو ستائیس اشعار میں منظوم کیا، اس کے علاوہ ان کی ایک منظوم کتاب "الدرر السنیۃ" کا بھی ذکر ملتا ہے، جو ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے[1]۔

کثرت عبادت علمی کمالات کے ساتھ عمل کے بھی پیکر تھے خشوع وخضوع وانابت الی اللہ عبادت وریاضت اور زہد وتقوی میں ان کا پایہ نہایت بلند تھا، حافظ ابن حجر جو ان کے شب وروز کے معمولات کے بڑے واقف کار تھے، لکھتے ہیں:

قد لازمتہ مدۃ فلم ارترک	میں ایک مدت تک ان کی صحبت میں
قیام اللیل بل صار کالمالوف	رہا، اس اثنا میں کبھی میں نے انھیں قیام
ویتطوع بصیام ثلاثۃ ایام	لیل کا ناغہ کرتے نہیں دیکھا، یہ گویا ان کی
فی کل شھر[2]	عادت سی بن گئی تھی، علاوہ ازیں وہ ہر مہینہ
	تین نفلی روزے بھی رکھتے تھے،

[1] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۳۱، [2] البدر الطالع ج ۱ ص ۳۵۶